رجب المرجب ۱۴۳۸ھ
اپریل ۲۰۱۷ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصوّر

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ
کا ایک اہم خطاب

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمۂ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات:360، قیمت475روپے

حصہ دوم سورۃ آلِ عمران تا سورۃ المائدہ
صفحات321، قیمت425روپے

حصہ سوم سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ
صفحات331، قیمت425روپے

حصہ چہارم سورۃ یُونس تا سورۃ الکہف
صفحات394، قیمت485روپے

حصہ پنجم سورۃ مریم تا سورۃ السّجدۃ
صفحات480، قیمت575روپے

حصہ ششم سورۃ الاحزاب تا سورۃ الحجرات
صفحات484، قیمت590روپے

حصہ ہفتم سورۃ قٓ تا سورۃ النّاس
صفحات560، قیمت650روپے

یکے از مطبوعات: انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
شائع کردہ: مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 66

شمارہ : 4

رجب المرجب 1438ھ

اپریل 2017ء

فی شمارہ -/30

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرونِ ملک 300 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
فون: 36316638 - 36366638
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5
مُلحد بلاگرز کی قلمی دہشت گردی — ادارہ

بیانُ القُرآن — 9
سورۃ العنکبوت (آیات ۱ تا ۱۳) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعمیرِ سیرت و کردار — 25
اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصور — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکّر و تدبّر — 41
قاریٔ قرآن کے امکانی سوالات اور ان کے جوابات — پروفیسر عبداللہ شاہین

وہ کیا گردوں تھا — 55
قرآن کریم اور ثقافتِ اسلامی — ڈاکٹر امداد حسین

دعوت فکر — 62
تقسیم وراثت کی اہمیت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

گوشۂ خواتین — 67
ظلم کی وسعت اور خواتین کے مظالم — بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

فہمِ دین — 77
فقیہہ کون؟ — مفتی اویس پاشا قرنی

یادِ رفتگاں — 87
حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۱۲) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

مُلحِد بلاگرز کی قلمی دہشت گردی

آج دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ دہشت گردی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہی دہشت گردی جب کمیونزم کے خلاف برسرِ پیکار تھی تو یہ مقدس جہاد تھا‘ جب مشرقی تیمور میں یہ مسئلہ درپیش تھا تو یہ عیسائی اقلیت کا حق تھا‘ لیکن فلسطین‘ کشمیر‘ افغانستان‘ عراق‘ مصر‘ لیبیا اور شام میں یہی حق جرم بن گیا۔ اسی طرح جب کسی معاشرے کی اکثریت مل کر حکومت بناتی ہے تو یہ ان کا جمہوری حق ہے‘ لیکن جب یہی اکثریت اسلام کی بنیاد پر اپنا نظامِ زندگی چاہتی ہے تو یہ ان کا سنگین جرم بن جاتا ہے۔ ایسے لوگ کسی بھی ملک میں ہوں وہ سنگین مجرم (Non-State Actors) ٹھہرتے ہیں۔ ریاست مخالف ہونے کا جرم نہ صرف ناقابلِ معافی ہے بلکہ ہر ملک چاہتا ہے کہ ایسے عناصر کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔ وہاں نہ تو انسانی حقوق کے علمبرداروں کو آزادیٔ اظہارِ رائے کا حق یاد آتا ہے‘ نہ قانون کو اور نہ ریاست کو‘ بلکہ سب کا ایک ہی مطالبہ نظر آتا ہے کہ ایسے لوگوں کی زبانیں کھینچ لی جائیں جو ریاست کے بیانیہ کے خلاف کوئی بات کریں۔ لیکن مذہب‘ خصوصاً اسلام جو ایک ریاست سے بڑھ کر کئی براعظموں کے انسانوں کے حقوق‘ جذبات‘ احساسات اور نظریات کی نمائندگی کرتا ہے‘ کی توہین کے سنگین ترین جرم کے مرتکب اور اللہ‘ جو ساری کائنات کا مالک و خالق ہے اور اُس کے رسول ﷺ جو تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں‘ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو سزا دینے کی بات آجائے تو انسانی حقوق کے علمبرداروں کو فوراً آزادیٔ اظہارِ رائے کا حق یاد آجاتا ہے۔ انسانیت کے ایسے سنگین مجرموں اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے باغیوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں ریاست کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور قانون کو بھی اپنے تقاضے یاد نہیں رہتے ہیں۔

یہ دوہرے معیارات اور تضادات ظاہر کرتے ہیں کہ جسے ریاست اور مذہب کی جنگ کہا جاتا ہے وہ اب صاف طور پر ریاست اور اسلام کی جنگ ہے۔ دہشت گردی صرف وہی ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے مفادات سے متصادم ہو‘ لیکن جہاں اسلام پر ضرب پڑتی ہو وہاں دہشت گردی کو پروموٹ کرنا عالمی امن کے ٹھیکیداروں کا فرضِ عین ہے۔ ریاست بھی صرف انہی عناصر کے خلاف active ہوگی جو نائن الیون کے بعد طاقت کے زور پر نافذ کیے گئے مغربی بیانیہ کے

خلاف مزاحمت کریں گے۔ نائن الیون کے بعد باقاعدہ حملہ کر کے نافذ کیا گیا بیانیہ ہی آج ہر ریاست کا بیانیہ ہے۔ اس کے خلاف آواز اٹھانے والے دہشت گرد بھی کہلائیں گے‘ ان کے خلاف فوجی عدالتیں بھی بنیں گی‘ ان کے خلاف نیشنل ایکشن پلان بھی بنیں گے۔ لہٰذا یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مسلمانوں کے بعض گروہوں نے 9/11 کی آڑ میں امریکہ کی ریاستی دہشت گردی کے جواب میں گروہی اور جماعتی دہشت گردی شروع کر دی اور خودکش حملوں سے معصوم شہریوں کا قتلِ عام کیا‘ جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے‘ لہٰذا ان کی بیخ کنی بھی اپنی جگہ بالکل درست ہے‘ قومی مفاد میں ایک ریاست کو یہ سب کچھ کرنا چاہیے تھا‘ لیکن جو اسلام‘ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی توہین کرنے والے بدبخت ہیں تو ریاست کی طرف سے ان پر بھی تو گرفت ہونی چاہیے۔ اس کے برعکس کچھ عرصہ سے پاکستان میں گستاخ بلاگرز کے معاملے میں جو ہو رہا ہے وہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کے خلاف قانونی کارروائی ہوتی اور انہیں سخت سے سخت سزا دی جاتی لیکن بجائے اس کے انہیں ماورائے قانون اٹھایا گیا اور پھر کچھ موم بتی مارکہ مظاہروں کے بعد نہ صرف باعزت گھر لا کر چھوڑ دیا گیا بلکہ کچھ ہی دنوں میں ان کا ملک سے فرار بھی معجزانہ طور پر ممکن ہوگیا۔ اگرچہ ایک جج نے اپنی حمیتِ دینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ اور رسول ﷺ کے ان دشمنوں کو قانون کے کٹہرے میں لانے کا عزم کیا ہے‘ لیکن بجائے اس کے کہ معزز جج کے اس اقدام پر انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے حکومتی اور ریاستی سطح پر ہر طرح سپورٹ فراہم کی جاتی اُلٹا ان کے اس اقدام کو ہی متنازعہ بنایا جا رہا ہے اور میڈیا پر اس جج کی کردارکشی کی ایک مہم چلائی جا رہی ہے‘ اور یہ سارا کچھ اس ملک میں ہو رہا ہے جو اس وعدے کے ساتھ حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں حضور ﷺ کا لایا ہوا نظام نافذ کیا جائے گا۔ بجائے اس کے آج اس ملک میں حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کی پروٹیکشن اور حمایت میں یہ سب ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا کمال اسی بیانیہ کا ہے جو نائن الیون کے بعد مغرب نے باقاعدہ حملہ کر کے ہمیں دیا‘ اور یہ بھی اسی بیانیہ کی پیدا کردہ مجبوری ہے جس نے اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک کے منتخب وزیراعظم کو ہولی کے تہوار میں شرکت کر کے یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ پاکستان اس لیے نہیں بنا تھا کہ ایک مذہب کو دوسرے پر dominance حاصل ہو جائے۔ نیز یہ کہ چاہے کوئی اللہ کہے‘ ایشور کہے یا واہ گرو کہے اصل میں ہم سب ایک ہیں۔ جبکہ اللہ کا قرآن کہتا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ”وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اس کو پورے نظامِ زندگی پر“ ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ ”اور خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو!“ (الصف)

پاکستان کا بننا بذاتِ خود ہندو اکثریت کے غلبہ سے نجات کا لازمی اور فطری ذریعہ تھا‘ جس کا لازمی ردّعمل اسلام کا غلبہ ہوتا‘ مگر تہذیب کے آزر نے وحدتِ اُمت کو توڑنے کے لیے جو بُت ہم سے ترشوائے ان کی بھینٹ اسلام کو ہی چڑھانا مقصود تھا۔ ؎

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　جو پیرہن ہے اس کا وہ مذہب کا کفن ہے

خلافت کے ادارے کو ختم کرنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کے پشتیبانوں نے امت مسلمہ کو جس طرح ٹکڑے ٹکڑے کیا اس کا لازمی اثر پاکستان پر بھی پڑنا تھا‘ اور یہ وہی اثر تھا جس کی ہلاکت خیزیوں سے اہل فکر ونظر اس وقت بھی بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ اقبال نے مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک مضمون میں لکھا:

’’میں نظریہ ٔوطنیت کی تردید اس زمانہ سے کر رہا ہوں جبکہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ یورپ کی دلی اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں نیرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگ عظیم (اول) میں کامیاب ہوگئی‘‘۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں: ’’اگر بعض علمائے مسلم اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سے اسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو ہر وقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ سے آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگی اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی۔‘‘

چنانچہ آج ریاست اور اسلام کی اس جنگ میں اگر اسلام مات کھا رہا ہے تو اس کی بہت سی وجوہات ہیں‘ جن میں سرفہرست مغرب کی دجالی تہذیب ہے‘ جس کا دنیا بھر پر تسلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے کہ پاکستان کے دفاع میں فوجی عدالتیں بنائی جائیں‘ نیشنل ایکشن پلان پر عمل درآمد کیا جائے‘ ضربِ عضب اور ردّالفساد کیا جائے‘ مگر اسلام‘ اللہ اور رسول ﷺ کی توہین کرنے والوں پر گرفت ڈالنا بھی ریاست کی ذمہ داری ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو واضح یہی ہو رہا ہے کہ یہ اس بیانیہ کی مجبوری ہے جو جنگ عظیم اوّل کے بعد میٹھے زہر کے طور پر مسلم دنیا میں پھیلایا گیا‘ پھر کمیونزم کی شکست کے بعد اس بیانیہ کے خالقوں نے اپنے تیور بدلے اور نائن الیون کے بعد اسے زبردستی مسلم دنیا پر ٹھونس دیا گیا۔ چنانچہ اب سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ میں اسلام کو دبانا‘ مسخ کرنا اور بدنام کرنا اس بیانیہ کی مجبوری ہے۔ لہٰذا ریاستوں اور

حکومتوں سے یہ توقع ہرگز نہ رکھنا چاہیے کہ وہ توہینِ اسلام وتوہینِ رسالت کے مرتکبین کو عبرت ناک سزا دے سکیں گی بلکہ ان سے اب اقلیتی مذاہب کی پشتیبانی‘ اسلام قبول کرنے پر پابندی لیکن اسلام سے انحراف اور روگردانی کے بے شمار مواقع پیدا کرنے‘ بے حیائی وفحاشی کے طوفان اور اسلام مخالف کلچر کے فروغ کے ذریعے اسلامی اقدار کو مٹانے‘ اسلام کا اصل چہرہ مسخ کرنے اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کی حوصلہ افزائی جیسے لبرل ہتھکنڈوں کی ہی توقع رکھنی چاہیے۔

دینی حلقوں اور مذہبی جماعتوں کو اگر اس حوالے سے فکرمندی لاحق ہے تو اس کا ایک ہی حل ہے کہ ریاستوں اور حکومتوں کی بجائے ملت کی سطح پر ایک بیانیہ ترتیب دیا جائے جو کہ خالصتاً اسلام کا بیانیہ ہو اور اس کے مطابق اُمت مسلمہ اپنا اور اپنے دین کا دفاع خود کرے‘ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ دین کا درد رکھنے والا اور آنحضور ﷺ سے محبت رکھنے والا ہر فرد ملت کا ایک فرد بن جائے کہ ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

پھر ملت کے یہ دردمند عالمی دجالی میڈیا پر انحصار کرنے کی بجائے ملت کی بنیاد پر ایسی صحافتی تنظیمیں تشکیل دیں جن کا مقصد ربط ملت کا احیاء‘ دین کی عظمت اور اقامت دین کی ضرورت کو اُجاگر کرنا اور مسلمان ممالک کے عوام میں اس حوالے سے شعور کو بیدار کرنا شامل ہو۔ ظاہر ہے ہم اسلام مخالف سازشوں کا مقابلہ تب ہی کر سکتے ہیں جب مغربی بیساکھیوں کو توڑ کر صرف اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ ؎

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے‘ تُو مصطفوی ہے

موجودہ حالات میں‘ جبکہ توہینِ رسالت کے ارتکاب سے دنیائے اسلام کے ہر سچے مسلمان کی روح کو زخمی کیا گیا ہے‘ اور یہی وہ حقیقی دہشت گردی ہے جس کے ردّعمل میں پھر بعض کم فہم مسلمان قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں‘ جبکہ وہ بھی صحیح راستہ نہیں ہے‘ شکستہ دل ہونے کی بجائے ہمیں چاہیے کہ ہم عالمی سطح پر ملت کی بنیاد پر باہمی ربط وتعلق بڑھائیں تو ممکن ہے یہ باہمی تعاون اور ربط تمام موجودہ مسائل سے اُمّتِ مسلمہ کو نکالنے کا موجب ثابت ہو۔ ؎

ملّت کے ساتھ رابطہ ٔ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ!

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ العَنکبُوت

تمہیدی کلمات

سورۃ العنکبوت کے بارے میں تعیین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ۵ نبویؐ میں نازل ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب مکہ میں مسلمانوں پر مشرکین کا ظلم وستم بہت بڑھ چکا تھا۔ اس سے پہلے تین سال تک تو مخالفین نے حضورﷺ کی دعوت کے اثرات کے بارے میں کوئی سنجیدہ ردِعمل ظاہر نہیں کیا' بلکہ اس دعوت کو چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس دوران وہ لوگ آپﷺ کا مذاق اڑاتے رہے' آپؐ کو شاعر اور جادوگر کہتے رہے اور یوں آپؐ کی تضحیک کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے ہتھکنڈوں سے آپؐ کی قوتِ ارادی دم توڑ دے گی' آپؐ بددل ہو کر ہمت ہار کر بیٹھ جائیں گے اور اس طرح یہ تحریک ختم ہو جائے گی۔ لیکن ان تمام حربوں کے باوجود حضورﷺ کی دعوت کا دائرہ تھا کہ روز بروز پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ خصوصی طور پر ان کے لیے تشویش ناک بات یہ تھی کہ آپؐ کی دعوت سے متاثر ہونے والوں میں زیادہ تعداد غلاموں اور اونچے گھرانوں کے نوجوانوں کی تھی۔ چنانچہ جب سردارانِ قریش کے کئی ایک غلام ایمان لے آئے اور دوسری طرف حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ جیسے نوجوان بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تو مشرکین کو اس دعوت کے تدارک اور سدِباب کے لیے سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو اہم فیصلہ کیا وہ یہی تھا کہ ایسے تمام لوگوں کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے اور جسمانی ایذاء وتشدد کے ذریعے انہیں نیا دین چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔

جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو اگرچہ نوجوان اہل ایمان بھی اپنے اپنے خاندان والوں کے ہاتھوں کسی حد تک تشدد کا نشانہ بنے' لیکن غلاموں اور بے آسرا لوگوں پر تو گویا قیامت ہی ٹوٹ

پڑی۔ غلاموں کی حیثیت اُس معاشرے میں ڈھور ڈنگروں کی سی تھی۔ جیسے آپ نے ایک بکری خریدی اور اسے اپنے کھونٹے سے باندھ لیا۔ جب تک چاہا اس سے فائدہ اٹھایا اور جب چاہا اسے ذبح کر لیا۔ انسانی سطح پر اُن کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ کوئی آقا اپنے غلام کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے' اسے مارے' پیٹے یا جان سے مار ڈالے' اسے کوئی پوچھ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت بلال' حضرت ابوفکیہہ اور حضرت خباب بن الارت ؓ جیسے صحابہ کے ساتھ ان کے آقاؤں نے ظلم وستم کے ایسے ایسے طریقے آزمائے کہ ان کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

غلاموں کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی اس خوفناک اور بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنے جو قریشی نہیں تھے اور کسی کے حلیف بن کر مکہ میں رہ رہے تھے۔ حضرت یاسرؓ کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ آپؓ کا تعلق یمن سے تھا۔ آپؓ نے یمن کے عیسائیوں سے نبی آخر الزماںﷺ کی آمد کا چرچا سن رکھا تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ کو خواب میں اشارہ بھی ملا تھا کہ مکہ میں آخری نبی کے ظہور کا زمانہ قریب ہے۔ چنانچہ نبی مکرمﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے شوق میں آپؓ یمن کو چھوڑ کر مکہ چلے آئے اور ابوجہل کے چچا کی پناہ حاصل کر لی۔ ابوجہل کا چچا شریف آدمی تھا' اُس نے نہ صرف انہیں پناہ دی بلکہ اپنی لونڈی سُمیہ سے ان کا نکاح بھی کر دیا۔ پھر اللہ نے آپؓ کو ایک بیٹا بھی عطا کیا۔ جب ابوجہل کا چچا فوت ہو گیا تو یہ خاندان ابوجہل کی پناہ میں آ گیا۔ حضورﷺ نے نبوت کا اعلان فرمایا تو حضرت یاسرؓ' آپؓ کی زوجہ محترمہ حضرت سمیہ اور آپؓ کا بیٹا عمار (ؓ) تینوں حضورﷺ پر ایمان لے آئے۔ جب قریش نے اہل ایمان پر تشدد کرنے کی حکمت عملی اپنائی تو اس چھوٹے سے خاندان پر ابوجہل نے تشدد کی انتہا کر دی۔ اس کے نتیجے میں حضرت یاسر اور حضرت سمیہؓ تو شہید ہو گئے جبکہ حضرت عمارؓ نے کلماتِ کفر کہہ کر اپنی جان بچائی' جس کا انہیں زندگی بھر افسوس رہا۔ (سورۃ النحل کی آیت ۱۰۶ میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اگر کسی کو کلمہ کفر پر مجبور کر دیا جائے لیکن اس کا دل ایمان پر مطمئن رہے تو اللہ معاف فرمانے والا ہے۔)

اسی طرح حضرت خباب بن الارتؓ پر جو قیامت گزری وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ آپؓ غریب خاندان سے تھے اور پیشے کے اعتبار سے لوہار تھے۔ ایک دن ان ہی کی بھٹی میں سے دہکتے ہوئے کوئلے لے کر انہیں زمین پر بچھایا گیا اور ان کی قمیص اتروا کر پشت کے بل کوئلوں پر لٹا

دیا گیا‘ تاوقتیکہ آپؓ کے جسم کی چربی سے وہ کوئلے ٹھنڈے ہوئے۔

حضرت خبابؓ بن الارت فرماتے ہیں کہ جب صورتِ حال ہمارے لیے ناقابل برداشت ہوگئی تو ایک دن ہم حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورﷺ اس وقت خانہ کعبہ کی دیوار کے سائے میں اپنی چادر کا تکیہ لیے استراحت فرما رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا: حضور! آپؐ ہمارے لیے اللہ سے دعا نہیں کرتے؟ مشرکین کے تشدد کی بڑھتی ہوئی کارروائیاں اب ہمارے لیے ناقابل برداشت ہوگئی ہیں۔ حضرت خبابؓ بیان کرتے ہیں کہ ہماری یہ بات حضورﷺ کو ناگوار گزری۔ آپؐ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: اللہ کی قسم‘ تم جلدی مچا رہے ہو‘ ابھی تم پر وہ حالات تو آئے ہی نہیں جو تم سے پہلے لوگوں پر آئے تھے۔ انہیں آدھا زمین میں دبا کر آروں سے چیر ڈالا گیا‘ وہ زندہ آگ میں جلا دیے گئے اور انہوں نے ایسے حالات پر صبر کیا۔ تمہیں بھی بہرحال صبر کرنا ہے۔ اللہ کی قسم! وہ وقت ضرور آئے گا جب ایک سوار صنعا سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی اور کا خوف نہیں ہوگا۔

یہ اس پس منظر کی ایک جھلک ہے جس میں اس سورت کا نزول ہوا۔ اس کی ابتدائی آیات میں حضرت خبابؓ کے بیان کردہ مذکورہ واقعہ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ان آیات کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی انقلابی تحریک اپنے کارکنوں کی قربانیوں کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ جب بھی کسی معاشرے میں کوئی انقلابی تحریک اپنی جڑیں مضبوط کرتی دکھائی دیتی ہے تو پرانے نظام کے محافظوں کو اپنے مفادات خطرے میں پڑتے محسوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایسی کسی بھی تحریک کو دبانے اور ختم کرنے کے لیے ہر حربہ آزمانے پر تیار ہوجاتے ہیں۔ اس مشکل مرحلے میں انقلابی تحریک اپنے کارکنوں سے قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ چنانچہ جب مکہ میں حضورﷺ کی دعوت کا چرچا ہوا اور لوگ اس طرف متوجہ ہونے لگے تو مشرکین مکہ نظامِ کہنہ کے پاسبانوں کی حیثیت سے اپنی پوری قوت کے ساتھ میدان میں آ گئے۔ اس کے بعد مکہ کی گلیوں میں ظلم وستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس جان گداز صورت حال میں اہل ایمان نے غیر معمولی جرأت اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔

اس سیاق وسباق میں سورت کا پہلا رکوع خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں مکہ کے مذکورہ خوفناک حالات کے حوالے سے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کے منطقی جوابات بھی فراہم کیے گئے ہیں‘ لہولہان جسموں کے لیے سہارے کا سامان بھی مہیا کیا گیا ہے اور زخم خوردہ

دلوں پر مرہم رکھنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ قیامت تک کے لیے ہر انقلابی دینی تحریک اور غلبۂ دین کی جدوجہد کے کارکنوں کے لیے راہنما اصول بھی وضع فرما دیے گئے ہیں۔ اس مضمون کے اعتبار سے سورۃ العنکبوت کا یہ رکوع گویا پورے قرآن میں ’’ذروۂ سنام‘‘ کی حیثیت رکھتا ہے۔ [یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ بحیثیتِ مجموعی قرآن کا ذروۂ سنام تو سورۃ البقرۃ ہے۔ حضورﷺ کا فرمان ہے: ((لِكُلِّ شَيْءٍ سَنَامٌ وَإِنَّ سَنَامَ الْقُرْآنِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ)) (۱) ’’ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن کی چوٹی سورۃ البقرۃ ہے۔‘‘] —— مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے پانچویں حصہ کا پہلا درس اسی رکوع پر مشتمل ہے۔ موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے یہ درس منتخب نصاب کے اس حصے کے لیے بمنزلہ فاتحہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آیات ۱ تا ۱۳

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾
وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ
الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا
يَحْكُمُوْنَ ﴿۴﴾ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ﴿۵﴾ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ
وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷﴾ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ
حُسْنًا ۭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ
اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ﴿۹﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا
بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ
نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب فضائل القرآن‘ باب ما جاء فی فضل سورۃ البقرۃ وآیۃ الکرسی۔

بِمَا فِیْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ
الْمُنٰفِقِیْنَ ﴿۱۱﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَلْنَحْمِلْ
خَطٰیٰکُمْ ؕ وَمَا ھُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰھُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾
وَلَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَھُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِھِمْ ۫ وَلَیُسْئَلُنَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ عَمَّا کَانُوْا
یَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾

آیت ۱ ﴿الٓمّٓ ﴿۱﴾﴾ ’’الف‘ لام‘ میم۔‘‘

آیت ۲ ﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾﴾ ’’کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا؟‘‘

تمہیدی کلمات میں بیان کی گئی حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی روایت کا مضمون ذہن میں رکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ آیت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مذکورہ شکایت کا جواب ہے۔ اس میں خفگی کا بالکل وہی انداز پایا جاتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی شکایت کے جواب میں اختیار فرمایا تھا۔ اہل ایمان کا ذکر عمومی انداز میں (’’النَّاس‘‘ کے لفظ سے) فرمانا بھی ایک طرح سے عتاب اور ناراضی ہی کا ایک انداز ہے۔ بہرحال دین میں تحریکی و انقلابی جدوجہد کے حوالے سے یہ بہت اہم مضمون ہے جس کی مزید وضاحت مدنی سورتوں میں ملتی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ میں یہی مضمون مزید واضح انداز میں بیان ہوا ہے: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَاْتِکُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ ؕ مَسَّتْھُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ ﴿۲۱۴﴾﴾ ’’کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تم پر وہ حالات و واقعات تو وارد ہوئے ہی نہیں جو تم سے پہلوں پر ہوئے تھے۔ ان پر سختیاں اور تکلیفیں مسلط کر دی گئی تھیں‘ اور وہ ہلا مارے گئے تھے‘ یہاں تک کہ (وقت کا) رسولؐ اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد! آگاہ رہو اللہ کی مدد قریب ہی ہے‘‘۔ اس کے بعد سورۂ آل عمران میں یہی بات ایک دوسرے انداز میں فرمائی گئی ہے: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ جٰھَدُوْا مِنْکُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۴۲﴾﴾ ’’کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت

میں یونہی داخل ہو جاؤ گے‘ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو ظاہر کیا ہی نہیں کہ تم میں سے کون واقعتاً (اللہ کی راہ میں) جہاد کرنے والے اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنے والے ہیں‘‘۔ اور پھر سورۃ التوبہ میں اس مضمون کی مزید وضاحت کی گئی ہے: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَکُوْا وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ جٰھَدُوْا مِنْکُمْ وَلَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلَا رَسُوْلِہٖ وَلَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَۃً ؕ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ’’کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے‘ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو ظاہر کیا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ہیں جو واقعی جہاد کرنے والے ہیں‘ اور جو نہیں رکھتے اللہ‘ اُس کے رسول اور اہل ایمان کے علاوہ کسی کے ساتھ دلی رازداری کا کوئی تعلق‘ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔‘‘

مندرجہ بالا چاروں آیات میں یہ مضمون جس انداز میں بیان ہوا ہے اس کی مثال ایک خوبصورت پودے اور اس پر کھلنے والے خوبصورت پھول کی سی ہے۔ زیر مطالعہ مکی آیت اس پودے کی گویا جڑ ہے جبکہ مذکورہ بالا تینوں مدنی آیات اس پر کھلنے والے پھول کی تین پتیاں ہیں۔ یہاں پر جن تین آیات کا حوالہ دیا گیا ہے (البقرۃ:۲۱۴‘ آل عمران:۱۴۲ اور التوبۃ:۱۶) ان میں یہ عجیب مماثلت قابل توجہ ہے کہ نہ صرف ان آیات کے الفاظ میں مشابہت پائی جاتی ہے بلکہ ان میں سے ہر آیت کے نمبر شمار کا حاصل جمع ۷ ہے۔

آیت ۳ ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ﴾ ’’ہم نے تو ان کو بھی آزمایا تھا جو ان سے پہلے تھے‘‘

ہم ان سے پہلے بھی ایمان کے ہر دعویدار کو آزماتے رہے ہیں اور آزمائش کے بغیر ہم کسی کے ایمان کو تسلیم نہیں کرتے۔

﴿فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ ﴿۳﴾﴾ ’’پس اللہ ظاہر کر کے رہے گا اُن کو جو سچے ہیں اور اُن کو بھی جو جھوٹے ہیں۔‘‘

اگرچہ ان الفاظ کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ ’’اللہ جان کر رہے گا‘‘ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم قدیم سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے اور وہ انسانوں کی نیتوں اور دلوں کے حالات سے بخوبی واقف ہے‘ اس لیے یہاں اللہ کے ’’جان لینے‘‘ کا مفہوم دراصل یہی ہے کہ اللہ ظاہر کر دے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے! وہ ممیّز کر دے گا کہ کون منافق ہے اور کون سچا مؤمن! کون ضعیف الایمان ہے اور کون قویُ الایمان! کون سچا جاں نثار ہے اور کون محض دودھ پینے والا مجنوں ہے!

یہاں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ گزشتہ دو آیات میں اگر خفگی کا اظہار ہے تو اگلی دو آیات میں اہل ایمان کی دلجوئی کا سامان بھی ہے۔ گویا ترہیب اور ترغیب ساتھ ساتھ ہیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شفیق استاد اپنے شاگرد کو ایک وقت میں ڈانٹ پلاتا ہے لیکن پھر اس کے بعد تھپکی دے کر اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ اس نکتے کو اس حدیث کے حوالے سے بھی سمجھنا چاہیے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ))[1] کہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ یعنی اللہ اپنی مخلوق اور خصوصاً اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ چنانچہ اس محبت اور شفقت کی جھلک اگلی آیت میں صاف نظر آ رہی ہے:

آیت ۴ ﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ④﴾ ''کیا سمجھ رکھا ہے ان لوگوں نے جو برائیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں کہ وہ ہماری پکڑ سے بچ کر نکل جائیں گے؟ بہت ہی برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔''

اس جملے کی روح کو سمجھنے کے لیے مکہ مکرمہ کے ماحول اور اس میں اہل ایمان کی دل دہلا دینے والی مظلومیت کے مناظر ایک دفعہ پھر اپنے تصور میں لائیے' جہاں ابوجہل کو کھلی چھوٹ تھی کہ وہ حضرت یاسر اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہما کو جس طرح چاہے بربریت کا نشانہ بنائے۔ اُمیّہ بن خلف مالک و مختار تھا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی قسمت کا کہ ان کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے۔ انہیں مار پیٹ کر لہولہان کر دے اور گرم ریت پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھ دے یا گلے میں رسّی ڈال کر مُردہ جانوروں کی طرح مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتا پھرے۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھیں تو آیت زیر مطالعہ کے الفاظ کا مفہوم یوں ہوگا کہ کیا بربریت کا یہ بازار گرم کرنے والے درندوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں؟ کیا ابوجہل اور اُمیّہ بن خلف کو خوش فہمی ہے کہ وہ ہماری گرفت سے بچ جائیں گے؟ نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہوگا! انہیں اس سب کچھ کا حساب دینا ہوگا۔ وہ وقت دور نہیں جب بہت جلد یہ پانسہ پلٹ جائے گا اور انہیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ چنانچہ چند ہی سال بعد غزوۂ بدر میں کفر اور ظلم کے بڑے بڑے علم برداروں کا حساب چکا دیا گیا۔ میدانِ بدر میں ہی امیّہ بن خلف کو بھی مکافاتِ عمل کے بے رحم شکنجے میں جکڑ کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قدموں میں ڈال دیا گیا۔ اُس وقت اگرچہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف نے کوشش بھی

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان:٦ /٢٥٢٨۔عن عبداللّٰہ بن مسعود وانس بن مالک رضی اللہ عنہما۔ ومشکاۃ المصابیح' کتاب الآداب' باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔

کی کہ وہ اُمیّہ کو قتل ہونے سے بچا لیں اور اسے قیدی بنا لیں لیکن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اسے جہنم رسید کر کے ہی چھوڑا: ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ ⑫﴾ (البروج) ''بلاشبہ آپ کے رب کی گرفت بہت سخت ہے!'' دراصل مکّہ میں بارہ سال تک ایک خاص حکمت عملی کے تحت مسلمانوں کو ہاتھ باندھے رکھنے' ہر طرح کا ظلم برداشت کرنے اور استطاعت کے باوجود بھی بدلہ نہ لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ گویا تحریک کے اس مرحلے میں انہیں ظلم سہنے اور سخت سے سخت حالات میں عزم و استقلال کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی تربیت کے عمل سے گزارا جا رہا تھا۔ اور ان خطوط پر مکمل تربیت اور تیاری سے قبل انہیں عملی طور پر تصادم کا میدان گرم کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ حکمت عملی دراصل تحریکی و انقلابی جدّوجہد کے فلسفے کا ایک اہم اور لازمی اصول ہے۔ علامہ اقبال نے اس کی ترجمانی یوں کی ہے: ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

بعد میں اللہ تعالیٰ کی مشیّت کے مطابق سورۃ الحج کی آیت ۳۹ کے اس حکم کے تحت اہلِ ایمان کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے گئے: ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ﴾ ''اب اجازت دی جا رہی ہے (قتال کی) ان لوگوں کو جن پر جنگ مسلط کر دی گئی ہے' اس لیے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔''

آیت ۵ ﴿مَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ ؕ﴾ ''جو کوئی بھی اللہ کی ملاقات کا امیدوار ہے تو (اسے یقین رکھنا چاہیے کہ) یقیناً اللہ کا معیّن کردہ وقت آ کر رہے گا۔''

یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ اگر ایک بندۂ مؤمن دنیا میں اپنا تن من دھن اُس کی راہ میں کھپا دے گا تو اُس کی اس قربانی کا صلہ اسے آخرت کی نعمتوں کی صورت میں دیا جائے گا۔ لیکن اللہ کا یہ وعدہ بہرحال ادھار کا وعدہ ہے۔ دوسری طرف دنیا کے ظاہری معاملات کو دیکھتے ہوئے انسان ''نو نقد نہ تیرہ ادھار'' کے اصول پر زیادہ اطمینان محسوس کرتا ہے۔ انسان کی اسی کمزوری سے شیطان فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کے دل میں وسوسے ڈال کر اس کے یقین کو متزلزل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے یہاں حضرت بلال' حضرت ابوفکیہہ اور حضرت خباب جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کی قائم کردہ مثالوں کی قیامت تک کے لیے پیروی کرنے والے

جاں نثاروں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ اے شمع توحید کے پروانو! شیطان تمہارے دلوں میں کسی قسم کا وسوسہ پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہونے پائے‘ تم اطمینان رکھو! تمہارے ساتھ کیے گئے اللہ کے تمام وعدے ضرور پورے ہوں گے اور آخرت کا وہ دن ضرور آ کر رہے گا جس دن تمہاری تمام قربانیوں کا بھرپور صلہ تمہیں دیا جائے گا۔

﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝﴾ ’’اور وہ سب کچھ سننے والا‘ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔‘‘

وہ تمہارے حالات سے بخوبی آگاہ ہے‘ تمہاری کوئی تکلیف اور کوئی قربانی اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے —— اب اگلی آیت میں پھر سرزنش کا انداز ہے:

آیت ۶ ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ ’’اور جو کوئی بھی جہاد کرتا ہے تو وہ اپنے (ہی فائدے کے) لیے جہاد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔‘‘

دیکھو! تم میں سے جو کوئی اللہ کی راہ میں جدوجہد کر رہا ہے‘ اس کے لیے تکلیفیں اٹھا رہا ہے اور ایثار کر رہا ہے تو یہ سب کچھ وہ اپنے لیے کر رہا ہے‘ اس کا فائدہ بھی اسی کو ملنے والا ہے۔ وہ اپنے ان اعمال کا اللہ پر احسان نہ دھرے۔ اللہ کو ان چیزوں کی کوئی احتیاج نہیں۔ وہ ان چیزوں سے بہت بلند اور بے نیاز ہے۔ سورۃ الحجرات میں اس مضمون کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ پر احسان جتاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ آپ کہہ دیجیے کہ تم لوگ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان مت دھرو‘ بلکہ یہ تو تم پر اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی‘ اگر تم (اپنے ایمان کے دعوے میں) سچے ہو۔‘‘

منّت مَنِہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت!

یعنی تم بادشاہ پر احسان مت دھرو کہ تم اس کی خدمت کر رہے ہو‘ بلکہ تم اس سلسلے میں بادشاہ کا احسان پہچانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع فراہم کیا ہے۔

نوٹ کیجیے ان آیات کے مندرجات انسانی دل و دماغ کے احساسات و خیالات سے کس قدر مطابقت رکھتے ہیں —— اب اگلی آیت میں پھر دلجوئی کا انداز ہے۔ گویا پہلے رکوع

میں ترہیب کا رنگ بھی ہے اور ترغیب کا انداز بھی اور یہ دونوں مضامین پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں۔ آغاز سرزنش سے ہوا تھا‘ پھر دلجوئی فرمائی گئی‘ اس کے بعد پھر سرزنش اور اب پھر دلجوئی:

آیت ۷ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ ’’اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہم لازماً دور کر دیں گے اُن سے اُن کی برائیاں‘‘

جو لوگ ایمان لانے کے بعد ایمان کے تقاضوں کو پورا کریں گے اور اس رستے میں آنے والی مصیبتوں اور تکلیفوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے ہم ان کے دامن پر سے گناہوں کے چھوٹے موٹے داغ دھبے دور کر دیں گے۔

﴿وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ ’’اور ہم لازماً اُن کو بہترین بدلہ دیں گے ان کے اعمال کا۔‘‘

زیر مطالعہ رکوع کے مضمون کی اہمیت کا اندازہ اس پہلو سے بھی لگائیں کہ ان آیات میں لام مفتوح اور نون مشدّد کی تکرار ہے۔ یعنی جا بجا انتہائی تاکید کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ آیت ۳ میں دو مرتبہ یہی تاکید کا صیغہ آیا ہے: ﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ جبکہ زیر مطالعہ آیت میں بھی دونوں باتوں میں تاکید کا وہی انداز پایا جاتا ہے۔

آیت ۸ ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ﴾ ’’اور ہم نے ہدایت کی ہے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی۔‘‘

مکہ کے مذکورہ حالات میں اسلام قبول کرنے والے بہت سے نوجوانوں کے لیے اپنے والدین کے ساتھ تعلقات کے بارے میں بھی ایک بہت سنجیدہ مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک طرف قرآن کی یہ ہدایت تھی کہ انسان اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے اور ان کی نافرمانی نہ کرے۔ دوسری طرف ایمان لانے والے بہت سے نوجوان عملی طور پر اپنے والدین سے بغاوت کے مرتکب ہو رہے تھے۔ چنانچہ ایسے تمام نوجوان اخلاقی اور جذباتی طور پر شدید دباؤ کا شکار تھے۔ مشرک والدین کا ان سے تقاضا تھا کہ تم ہماری اولاد ہو‘ ہم نے پال پوس کر تمہیں بڑا کیا ہے‘ لہٰذا تم پر لازم ہے کہ ہمارا حکم مانو اور محمد (ﷺ) سے تعلق توڑ کر اپنے مذہب پر واپس آ جاؤ۔ جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا معاملہ تھا۔ آپؓ کے والد فوت ہو چکے تھے۔ والدہ نے انہیں بہت ناز و نعم سے پالا تھا۔ آپؓ بہت سلیم الفطرت اور شریف النفس

نوجوان تھے اور اپنی والدہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ آپؓ کے ایمان لانے پر آپؓ کی والدہ نے ’’مرن برت‘‘ رکھ لیا اور قسم کھالی کہ اگر اس کا بیٹا اپنے والد کے دین پر واپس نہ آیا تو وہ بھوکی پیاسی رہ کر خود کو ہلاک کر لے گی۔ تصور کریں کہ ماں بھوک اور پیاس سے مر رہی ہے اور بیٹا اس کی اس حالت کو بے چارگی سے دیکھ رہا ہے۔ ایک فرمانبردار بیٹے کے لیے یہ کس قدر سخت امتحان تھا! چنانچہ یہ سوال بہت اہم تھا کہ ایسے نوجوان ان حالات میں کیا کریں؟ ایک طرف والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم اور وہ بھی اس تاکید کے ساتھ کہ قرآن میں متعدد مقامات پر (البقرۃ:۸۳‘ النساء:۳۶‘ الانعام:۱۵۱‘ بنی اسرائیل:۲۳‘ لقمان:۱۴) اللہ تعالیٰ نے اپنے حق عبادت کا ذکر کرنے کے بعد والدین کے حقوق کا ذکر فرمایا ہے۔ دوسری طرف مشرک والدین کا یہ اصرار کہ ان کی اولاد ان کی فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے اسلام کو چھوڑ کر واپس ان کے دین پر آ جائے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں اس نازک مسئلہ کے بارے میں راہنمائی فرمائی گئی ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ط﴾ ’’اور اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ شریک ٹھہراؤ ایسی چیزوں کو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں تو ان کا کہنا مت مانو۔‘‘

نوٹ کیجیے یہاں ’’جہاد‘‘ کا لفظ مشرک والدین کی اس ’’کوشش‘‘ کے لیے استعمال ہوا ہے جو وہ اپنی اولاد کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے کر سکتے تھے۔ گویا یہاں یہ لفظ اپنے خالص لغوی معنی (جدوجہد کرنا‘ کوشش کرنا) میں آیا ہے۔

اس آیت میں بہت واضح انداز میں اولاد کے لیے والدین کی فرمانبرداری کی ’’حد‘‘ (limit) بتادی گئی کہ والدین کے حقوق بہر حال اللہ کے حقوق کے بعد ہیں۔ یعنی اللہ کا حق‘ اس کا حکم اور اس کے دین کا تقاضا ہر صورت میں والدین کے حقوق اور ان کی مرضی پر فائق رہے گا۔ لہٰذا کسی نوجوان کے والدین اگر اسے کفر و شرک پر مجبور کر رہے ہوں تو وہ ان کا یہ مطالبہ مت مانے۔ البتہ اس صورت میں بھی نہ تو وہ ان کے ساتھ بدتمیزی کرے اور نہ ہی سینہ تان کر جواب دے‘ بلکہ ادب سے انہیں سمجھائے کہ ان کا یہ حکم ماننا اس کے لیے ممکن نہیں‘ اس لیے اس کی درخواست ہے کہ وہ اس کے لیے اس پر دباؤ نہ ڈالیں۔ اس سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے مشرک والد کے ساتھ مکالمہ (سورۂ مریم‘ آیات ۴۲ تا ۴۵) اس حکمت عملی

کی بہترین مثال ہے۔ اس مکالمے میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپؑ اپنے والد کو بار بار یٰۤاَبَتِ‘ یٰۤاَبَتِ (ابا جان! ابا جان!) کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ والدین کے حقوق کے حوالے سے یہ مضمون سورۂ لقمان میں زیادہ وضاحت سے بیان ہوا ہے۔

﴿اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸﴾ ’’میری ہی طرف تمہیں لوٹ کر آنا ہے‘ پھر میں تمہیں بتادوں گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔‘‘

آیت ۹ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ۝۹﴾ ’’اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہم انہیں لازماً داخل کریں گے صالحین میں۔‘‘

نیک اہل ایمان کو صالحین کے گروہ میں شامل کرنے کا یہ وعدہ دنیا کے لیے بھی ہے اور آخرت کے لیے بھی۔ اس مژدۂ جانفزا کے مفہوم کو بھی مکہ کے مذکورہ حالات کے پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے‘ جہاں اہلِ ایمان اپنے پیاروں سے کٹ رہے تھے‘ والدین اپنے جگر گوشوں کو چھوڑنے پر مجبور تھے‘ اولاد والدین کی شفقت و محبت سے محروم ہو رہی تھی اور بھائی بھائیوں سے جدا ہو رہے تھے۔ جیسے سردارِ قریش عتبہ بن ربیعہ کے بڑے بیٹے حذیفہ رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے جبکہ چھوٹا بیٹا ولید کافر ہی رہا۔ (عتبہ اور اس کا بیٹا ولید غزوۂ بدر میں سب سے پہلے مارے جانے والوں میں سے تھے۔) اگر انسانی سطح پر دیکھا جائے تو حضرت حذیفہؓ کے لیے یہ بہت کڑا امتحان تھا۔ بہر حال جو صحابہؓ اس آزمائش اور امتحان سے دوچار ہوئے انہوں نے غیر معمولی حوصلے اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن آخر تو وہ انسان تھے‘ اندر سے ان کے دل زخمی تھے اور ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آیت زیر نظر کو اس سیاق و سباق میں پڑھا جائے تو اس کا مفہوم یوں ہوگا کہ اے میرے جاں نثار بندو! اگر تم لوگ مجھ پر اور میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اپنے والدین‘ بھائی بہنوں اور عزیز رشتہ داروں سے کٹ چکے ہو تو رنجیدہ مت ہونا۔ دوسری طرف ہم نے تمہارے لیے نبی رحمت اور اہل ایمان کے گروہ کی صورت میں نئی محبتوں اور لازوال رفاقتوں کا بندوبست کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں تمہارے لیے ایک نئی برادری تشکیل پا رہی ہے جس کی بنیاد ایک مضبوط نظریے پر رکھی گئی ہے۔ اب تم لوگ اس نئی برادری کے رکن بن کر ہمارے برگزیدہ بندوں کے گروہ میں شامل ہو گئے ہو‘ جہاں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں کو اپنے سینے سے لگانے کے لیے منتظر ہیں اور جہاں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

اپنے ساتھیوں سمیت تم لوگوں پر اپنی محبت وشفقت کے جذبات نچھاور کرنے کو بے قرار ہیں۔ اس حوالے سے نبی اکرم ﷺ کو بھی بار بار یاد دہانی کرائی جا رہی ہے (سورۃ الحجر:۸۸ اور سورۃ الشعراء:۲۱۵) کہ مؤمنین کے لیے آپؐ اپنے کندھوں کو جھکا کر رکھیے اور ان کے ساتھ محبت ورأفت کا معاملہ کیجیے۔

دوسری طرف صالحین کے گروہ میں شمولیت کی اس خوشخبری کا تعلق آخرت سے بھی ہے' جس کا واضح تر اظہار سورۃ النساء کی اس آیت میں نظر آتا ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾﴾ ''اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی تو ایسے لوگوں کو معیت حاصل ہوگی ان لوگوں کی جن پر اللہ کا انعام ہوا یعنی انبیاء کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے!''

آیت ۱۰ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر' مگر جب انہیں اللہ کی راہ میں ایذا پہنچائی جاتی ہے تو وہ لوگوں کی ایذا رسانی کو اللہ کے عذاب کی مانند سمجھ لیتے ہیں۔''

یعنی لوگوں کی طرف سے ڈالی گئی آزمائش سے ایسے گھبرا جاتے ہیں جیسے ان پر اللہ کا عذاب نازل ہو گیا ہو۔ یہاں یہ نکتہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ آیت مکہ میں اُس وقت نازل ہوئی جب اسلام میں منافقت کا شائبہ تک نہ تھا' بلکہ یہ وہ وقت تھا جب کلمہ توحید کا اقرار کرنے والے ہر شخص پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں جو کوئی بھی اسلام قبول کرتا تھا اس کے ایمان میں کسی شک وشبہ کا امکان نہیں تھا۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ سب لوگوں کی طبیعتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں اور جذبۂ بہادری' استقامت وغیرہ میں سب انسان برابر نہیں ہوتے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں اسی حوالے سے ایک ایسے کردار کا ذکر ہو رہا ہے جو ایمان تو پورے خلوص سے لایا ہے مگر اس راستے کی مشکلات اور آزمائشوں کو جھیلنے کا حوصلہ اس میں نہیں ہے۔

﴿وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) اگر آپ کے رب کی طرف سے مدد آجائے''

﴿لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ﴾ ''یہ ضرور کہیں گے کہ ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہی تو تھے۔''

جب صورتِ حال تبدیل ہو جائے گی اور دین کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینے والوں کو اللہ تعالیٰ فتح ونصرت سے ہم کنار کرے گا تو اس کردار کے لوگ فتح کے ثمرات میں حصہ دار بننے کے لیے آموجود ہوں گے کہ ہم تو دل سے آپ ہی کے ساتھ تھے۔ گویا یہ وہی کردار ہے جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کے آغاز میں بھی ہوا ہے اور سورۃ الحج کی اس آیت میں اس کی نفسیاتی کیفیت کو مزید واضح کر دیا گیا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰي حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰي وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿١١﴾﴾ (الحج) ''اور لوگوں میں سے کوئی وہ بھی ہے جو اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے پر رہ کر۔ پھر اگر اسے کوئی فائدہ پہنچے تو اس کے ساتھ مطمئن رہے' اور اگر اسے کوئی آزمائش آجائے تو منہ کے بل الٹا پھر جائے۔ وہ دنیا میں بھی خسارے میں رہا اور آخرت میں بھی۔ یہی ہے واضح خسارہ۔''

﴿اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠﴾﴾ ''تو کیا اللہ بخوبی واقف نہیں ہے اس سے جو جہان والوں کے سینوں میں مضمر ہے؟''

آیت ۱۱ ﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿١١﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ ظاہر کر کے رہے گا سچے اہل ایمان کو بھی اور ظاہر کر کے رہے گا منافقین کو بھی۔''

یعنی ابھی اس مرض کی ابتدا ہے۔ اگر تم لوگ nip the evil in the bud کے مصداق ابھی سے اس کا علاج کر لو گے تو بچ جاؤ گے۔ منافقت کا مرض ٹی بی کے مرض کی طرح ہے جو انفیکشن سے شروع ہوتا ہے اور مختلف مراحل سے گزرتا ہوا لا علاج روگ بن جاتا ہے۔ چنانچہ ابھی تم لوگوں کو اس مرض کی انفیکشن ہوئی ہے۔ اگر ابھی تم نے اس کے تدارک کی فکر نہ کی اور یہ روگ ابتدائی مرحلے سے آگے بڑھ گیا تو مہلک اور لا علاج مرض (باقاعدہ منافقت) کی شکل اختیار کر جائے گا۔

اس آیت کے حوالے سے ایک خصوصی نکتہ یاد رکھنے کا یہ ہے کہ مکی قرآن کا یہ واحد مقام ہے جہاں لفظ ''منافق'' آیا ہے۔ سورۃ الحج کی مذکورہ بالا آیت میں بھی منافقانہ کردار کا ذکر ہوا ہے' لیکن ''منافق'' کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔

آیت ۱۲ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ

خَطٰيٰكُمْ ؕ﴾ ’’اور یہ کافر کہتے ہیں اہل ایمان سے کہ تم ہمارے راستے کی پیروی کرو‘ ہم (آخرت میں) تمہاری خطاؤں کا بوجھ اٹھالیں گے۔‘‘

اس آیت میں مکہ کے ماحول میں ایمان لانے والے نوجوانوں کے تیسرے اہم مسئلے کی نشاندہی ملتی ہے۔ یعنی رشتوں کے کٹنے اور کہیں کہیں حوصلے کی کمزوری کے اظہار کے علاوہ ایک سنجیدہ مسئلہ یہ بھی تھا کہ قبیلے کے بڑے بوڑھے ناصحانہ انداز میں نوجوانوں کو سمجھانے بیٹھ جاتے تھے کہ دیکھو برخوردار! تم نوجوان ہو‘ باصلاحیت ہو‘ خاندانی کاروبار کے وارث ہو‘ ایک مثالی کیرئیر اور روشن مستقبل تمہارے سامنے ہے۔ مگر تم جذبات میں آ کر ایک ایسا راستہ اپنانے جا رہے ہو جس میں مشکلات‘ پریشانیوں اور افلاس کے سوا تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ ہماری طرف دیکھو! ہم نے اس دنیا میں ایک عمر گزاری ہے‘ ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے‘ ہم زندگی کے نشیب و فراز اور نفع و نقصان کے تمام پہلوؤں کو خوب پہچانتے ہیں۔ اس نئے دین کی باتیں ہم نے بھی سنی ہیں‘ مگر ہم ان کو سن کر جذباتی نہیں ہوئے۔ ہم نے پوری سمجھ بوجھ سے ان باتوں کا تجزیہ کیا ہے اور پھر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارا فائدہ اپنے پرانے طریقے اور اپنے باپ دادا کے دین کی پیروی میں ہی ہے۔ لہٰذا تم ہماری بات مانو اور اپنے پرانے طریقے پر واپس آ جاؤ۔ رہی بات آخرت کے احتساب کی تو اس کی ذمہ داری تمہاری طرف سے ہم اٹھاتے ہیں۔ وہاں اگر کوئی سزا ہوئی تو وہ تمہاری جگہ ہم بھگت لیں گے۔

﴿وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ⑫﴾ ’’اور وہ نہیں اٹھانے والے ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی۔ یقیناً وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔‘‘

آیت ۱۳ ﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ ’’البتہ وہ لازماً اٹھائیں گے اپنے بوجھ بھی اور ان کے ساتھ کچھ دوسرے بوجھ بھی۔‘‘

یعنی آخرت میں یہ لوگ صرف اپنی گمراہی کی سزا ہی نہیں بھگت رہے ہوں گے بلکہ بہت سے دوسرے لوگوں کو گمراہ کرنے کا خمیازہ بھی انہیں بھگتنا ہوگا۔ لیکن اے اہل ایمان! اگر تم میں سے کوئی خطا کرے گا تو اس کے لیے وہ خود ہی جوابدہ ہوگا۔ تمہاری کسی خطا کا بوجھ یہ لوگ نہیں اٹھا سکیں گے۔

﴿وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ⑬﴾ ’’اور ان سے لازماً باز پرس

ہوگی قیامت کے دن اس کے بارے میں جو جھوٹ یہ گھڑ رہے ہیں۔‘‘

اس آیت میں تاکید کا پھر وہی انداز ہے (لام مفتوح اور نون مشدد) جو اس سے پہلے آیات ۳‘ ۷ اور ۱۱ میں آ چکا ہے۔ یعنی قیامت کے دن دوسروں کی خطاؤں کا بوجھ اٹھانے کا یہ دعویٰ ان کا خود ساختہ جھوٹ ہے اور اس دن اپنی اس افترا پردازی کا بھی انہیں حساب دینا پڑے گا۔ اس سلسلے میں اللہ کا اٹل فیصلہ اور قانون بہر حال یہ ہے: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ﴾ (الاسراء: ۱۵) کہ اس دن کوئی بوجھ اٹھانے والی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

اس سورت کی ابتدائی بارہ آیات (پہلی آیت حروفِ مقطعات پر مشتمل ہے) اپنے مضمون کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ چنانچہ کسی بھی دینی انقلابی تحریک کے کارکنوں کو چاہیے کہ ان آیات کو حرزِ جان بنا لیں اور ان میں درج ہدایات و فرمودات کو اپنے قلوب و اذہان میں پتھر پر لکیر کی مانند کندہ کر لیں۔

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت و فرضیت، بعنوان:
توحیدِ عملی
سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
اشاعت خاص 150 روپے، اشاعت عام 100 روپے

اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصوّر

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا مرکزی انجمن خدام القرآن کی دس سالہ تقریب
منعقدہ جناح ہال لاہور کے افتتاحی اجلاس میں
۱۲/ نومبر ۱۹۸۲ء کا خطاب

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۵﴾﴾ (الحدید)

وَقَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی کَمَا وَرَدَ فِیۡ سُوۡرَۃِ الشُّوۡرٰی:

﴿فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ ۚ وَ اسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ ۚ وَ قُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنۡ کِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۵) صدق اللہ العظیم

رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ، وَیَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ ، وَاحۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ، یَفۡقَہُوۡا قَوۡلِیۡ!

محترم صدرِ مجلس، محترم مہمان خصوصی، علمائے کرام اور محترم حاضرین!

میری آج کی گفتگو دراصل ایک سلسلۂ تقاریر کی تیسری کڑی ہے۔ اس سے قبل دو خطاباتِ جمعہ میں ''اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور'' کے موضوع پر مسجد دار السلام میں اپنے کچھ خیالات کا اظہار کر چکا ہوں، جن میں میں نے عرض کیا تھا کہ اصلاحِ معاشرہ کا جو قرآنی پروگرام میرے سامنے آتا ہے، اس کی تین سطحیں ہیں۔ ایک اس کی جڑ اور بنیاد ہے، جسے میں نے پچھلی تقاریر میں ''پیڑ'' سے تعبیر کیا تھا۔ ایک اس کا ذروۂ سنام یعنی چوٹی ہے جسے میں نے

''سر'' سے تعبیر کیا تھا اور ایک اس کی درمیانی سطح ہے جس کو میں نے ''دھڑ'' قرار دیا تھا۔

اس کی جڑ اور بنیاد تعمیر سیرت و کردار کا پروگرام ہے اور میں اس ضمن میں عرض کر چکا ہوں کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہ بات لوگوں کو معلوم نہیں کہ خیر کیا ہے، شر کیا ہے، نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے، بلکہ اصل مسئلہ وہی ہے جسے مرزا غالب نے اپنے اس شعر میں بیان کیا کہ: ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

پھر طبیعت کو اِدھر لانے کے لیے اصل ضرورت ایک مضبوط قوتِ ارادی اور تربیتِ ارادہ کی ہے، جسے علامہ اقبال نے تعمیر خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے درحقیقت انسان کے جذبے کے درست ہونے کی ضرورت ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ بنیادی طور پر انسان کے جذبات دو طرح کے ہیں: ایک ہے محبت کا مثبت جذبہ اور ایک ہے خوف کا منفی جذبہ۔ دنیا کے دوسرے نظاموں اور معاشروں میں محبت کا جذبہ کہیں وطن کی محبت، کہیں قوم کی محبت، کہیں نسل کی محبت، کہیں زبان کی محبت، کہیں کسی شخصیت کی محبت پر استوار ہوتا ہے اور ان محبتوں کی بنیاد پر ہی سیرت و کردار کی تعمیر ہوتی ہے، لیکن اسلام نے جو بلند ترین محبتیں عطا کی ہیں، وہ ہیں اللہ کی محبت اور اس کے رسول ﷺ کی محبت۔

میں نے گزشتہ تقاریر میں عرض کیا تھا کہ اصل میں ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم انسانی فکر و نظر کی مقرر کردہ محبتوں اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ محبتوں، دونوں سے تہی دست اور تہی دامن ہیں۔ اگر وطن، قوم، نسل، زبان، یا کسی شخصیت کی محبت ہوتی تو کم سے کم دنیا میں ایک باوقار زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں کوئی بنیاد مل جاتی، لیکن یہ محبتیں ہمارے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ ہمارا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے، اس میں ان محبتوں کی کوئی بنیاد اور کوئی گنجائش نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے صحیح کہا تھا کہ ع ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!'' یعنی ہم زمین کے ساتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ ہمارا ذہن اور ہمارا مزاج وطن پرستی، قوم پرستی، نسل پرستی، زبان پرستی، شخصیت پرستی سے قطعی مناسبت نہیں رکھتا اور ان سے بہت بعید ہے۔ لہٰذا ہمارے پاس یہ محبتیں بھی نہیں ہیں اور جو محبتیں ہونی چاہئیں تھیں یعنی اللہ کی محبت اور اس کے رسول ﷺ کی محبت، بدقسمتی سے ہم ان سے بھی محروم اور تہی دامن ہیں۔ گویا ہم درحقیقت خلا میں ہیں کہ ہمارے

نیچے وہ زمین ہی موجود نہیں ہے جس پر ایک قومی سیرت و کردار کی بنیاد پڑ سکے۔

محبت کے مثبت جذبے کے ضمن میں' میں نے عرض کیا تھا کہ قوم' وطن' نسل' زبان اور شخصیت سے ایک بلند تر محبت بھی انسانی ذہن و فکر نے اختراع کی ہے اور وہ ہے کسی نظریہ (idealogy) اور کسی نظام کی محبت' جس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ محبت دراصل انسان اور انسانیت کی محبت پر مبنی ہے۔ کسی نظام عدل کو قائم کرنے اور کسی معاشرے سے استحصال ختم کرنے کے لیے کوئی نظریہ اور کوئی نظام کسی کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے تو ایسے شخص کے دل میں اس نظام کو قائم کرنے کے لیے ایثار' قربانی' جدوجہد اور کشمکش کا بے پایاں جذبہ اُبھرتا ہے۔ لہٰذا کسی نظریے اور کسی نظام کی محبت میں بھی سیرت و کردار کی تعمیر کی تاثیر موجود ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمیں جہاد فی سبیل اللہ کی محبت دی گئی ہے۔ میں نے گزشتہ تقاریر میں سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ آپ کو سنائی تھی:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۲۴﴾

ان تین محبتوں یعنی اللہ عزوجل کی محبت' اس کے رسول ﷺ کی محبت اور اس کی راہ میں جہاد کی محبت پر اگر علائق دنیوی کی پانچ محبتیں یعنی باپ' بیٹے' بھائی' بیویوں اور برادری کی محبتیں —— یہ پانچ محبتیں علائق دنیا یعنی رشتہ داری سے متعلق ہیں جن کو علامہ اقبال نے ''رشتہ و پیوند'' سے تعبیر کیا ہے —— اور سامانِ دنیا کی تین محبتیں یعنی مال' تجارت اور مکانات محبتیں —— یہ تین محبتیں سامانِ دنیا اور متاعِ دنیا سے متعلق ہیں —— غالب آگئیں تو قرآن کریم کہتا ہے: جاؤ دفع ہو جاؤ اور انتظار کرو' یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے' اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

لہٰذا اسلام نے یہ تین محبتیں تعمیر سیرت و کردار کے لیے مثبت جذبے کی اساسات کے طور پر عنایت کی ہیں اور آخرت کا خوف منفی جذبے کے طور پر دیا ہے۔ یعنی محاسبۂ اُخروی اور اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے لیے کھڑے ہونے کا خوف بھی تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے ہے۔

سورۃ النازعات میں فرمایا: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۴۰ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۴۱﴾ ''اور جو کوئی ڈرتا رہا اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہونے (کے خیال) سے اور اُس نے روکے رکھا اپنے نفس کو خواہشات سے' تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ جنت ہی ہے''۔ پس اسلام نے تعمیر سیرت و کردار کے لیے دو بنیادیں انسان کو دی ہیں۔ پہلی بنیاد محبت کی بنیاد ہے اور وہ ہے اللہ' اُس کے رسولؐ اور اُس کی راہ میں جہاد کی محبت' جو درحقیقت میری آج کی تقریر کا اہم موضوع ہے۔ دوسری بنیاد خوف کی بنیاد ہے اور وہ ہے محاسبۂ اخروی کا خوف۔ پھر یہی اساسات انسان کے ارادے کو تقویت فراہم کرتی ہیں۔

میں نے گزشتہ تقاریر میں عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں سیرت و کردار سازی کا ایک نظام طویل عرصے تک قائم اور جاری رہا ہے' جو بہت مؤثر اور کامیاب بھی رہا ہے' آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ اس نظام کا نقطہ آغاز لفظ ''ارادہ'' ہے' جس سے اسم فاعل ''مرید'' بنتا ہے یعنی وہ شخص جو ارادہ کر لیتا ہے۔ اصل میں وہ اپنے ارادے کی تقویت اور پختگی کے لیے کسی سلسلہ تصوف میں داخل ہوتا ہے اور وہاں سے کسبِ فیض کرتا ہے۔ لہٰذا انسان کے ارادے کی تقویت اس کی سیرت کی تعمیر میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

تعمیر سیرت و کردار کی درمیانی سطح کے متعلق میں نے پچھلی تقاریر میں عرض کیا تھا کہ تعزیر و سزا' اوامر و نواہی اور احتساب سے بھی دنیا کے دوسرے نظاموں اور معاشروں میں خوف کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے' لیکن اگر یہ خوف اور مواخذہ' محاسبہ اُخروی سے آزاد ہو تو اس میں بہت سے چور دروازے پیدا ہو جاتے ہیں اور تعزیرات کے اس نظام سے نہ صحیح عدل و انصاف میسر آتا ہے اور نہ ہی معاشرے کو امن و سکون حاصل ہوتا ہے۔ کرپشن اس کو بڑی حد تک غیر مؤثر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ چیز بالکل اظہر من الشمس ہے اور ہم میں سے اکثر و بیشتر کو اس کا علم بھی ہے اور تجربہ بھی ہے' لہٰذا مجھے تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام نے ایک طرف دُنیوی طور پر حدود و تعزیرات میں شدید ترین سزائیں رکھی ہیں' کہ اگر ایک شخص کو وہ سزا مل جائے تو ہزاروں کے چھکے چھوٹ جائیں۔ یہ بھی یقیناً اسلامی نظام کا ایک اہم جزو ہے' لیکن اسلام اپنے ماننے والوں کے قلوب و اذہان میں اصل خوف آخرت کا جاگزیں کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے میں گزشتہ تقاریر میں قرآن مجید کی متعدد آیات پیش کر چکا ہوں۔ حدود و تعزیرات

پر مبنی نظام تو معاشرے میں حقیقی امن و امان کی فضا قائم رکھنے کے لیے تجویز کیا گیا ہے اور درحقیقت اس طرح ایک اضافی خوف معاشرے کو دیا گیا ہے‘ ورنہ حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے اصل خوف‘ خوفِ آخرت ہی ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کی چوٹی

یہ وہ باتیں ہیں جن پر میں اپنے گزشتہ دو خطاباتِ جمعہ میں تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں اور صرف ربط قائم کرنے کے لیے بطور تمہید و تذکیر میں نے ان کا آج پھر سے اعادہ کیا ہے۔ لیکن آج مجھے تعمیر سیرت و کردار کے ذروۂ سنام یعنی چوٹی والی سطح پر اظہارِ خیال کرنا ہے۔ وہ چوٹی والی بات یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے میں جو نظامِ اجتماعی قائم ہے‘ وہ اگر انصاف اور عدل وقسط پر مبنی نہیں ہے تو اس معاشرے میں نہ تو اصلاح کی کوئی شکل پیدا ہوسکتی ہے اور نہ ہی اصلاح کی کوئی کوشش کامیاب ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ ناانصافی‘ ظلم اور عدوان سے انسان میں منفی جذبات پیدا ہوتے ہیں‘ اس سے دلوں میں کدورت اور نفرت وجود میں آتی ہے اور عداوت اور انتقام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں مثبت اور تعمیری فضا موجود نہیں ہوتی کہ جس کے ذریعے سے تعمیر سیرت و کردار کے لائحہ عمل کو غذا حاصل ہوسکے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی پودا زمین سے سر نکالے تو اس کے پھلنے پھولنے کے لیے جہاں بیج کا صالح ہونا اور زمین کا زرخیز ہونا ضروری ہے وہاں اس کو وہ فضا بھی لازماً درکار ہے جو اس کو غذا دے اور اس کی نشوونما کے لیے ساز گار ہو۔ اگر یہ فضا میسر نہیں ہے تو پودا پروان چڑھنے کے بجائے مرجھا جائے گا۔ بالکل یہی مثال اس نظام کی ہے جو بالفعل قائم و نافذ ہے۔ اگر وہ نظام انصاف اور عدل وقسط پر مبنی نظام نہیں ہے تو وہ نفرت کو جنم دے گا‘ اس سے منفی احساسات وجود میں آئیں گے‘ اس سے عداوت اور انتقام کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اس سے صالح اور تعمیری جذبات کسی طور پر بھی پروان نہ چڑھ سکیں گے۔

اس ضمن میں سورۃ المائدۃ کی وہ آیت ذرا ذہن میں لایئے جو خمر (شراب) اور میسر (قمار‘ جوا) کے بارے میں آخری آیت ہے: ﴿اِنَّمَا یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّوۡقِعَ بَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃَ وَالۡبَغۡضَآءَ فِی الۡخَمۡرِ وَالۡمَیۡسِرِ﴾ (آیت۹۱) ’’شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کردے شراب اور جوئے کے ذریعے سے‘‘۔ یعنی یہ بات شیطان

کے ہتھکنڈوں میں سے ہے کہ وہ تمہارے درمیان کدورت ونفرت اور عداوت و انتقام کے جذبات پیدا کرے۔ شیطان یہ کام شراب اور جوئے کے ذریعے بھی لیتا ہے اور غیر منصفانہ اور غیر عادلانہ نظامِ حکومت کے ذریعے بھی۔ ایسا نظام جس میں غیر منصفانہ نظامِ معیشت‘ اونچ نیچ اور استحصال موجود ہو تو شیطان ان وجوہ کی بنا پر بھی بہت بڑے پیمانے پر اکثریت کے ذہنوں میں محرومیوں کا احساس اور نفرت و دشمنی کے جذبات پیدا کرتا ہے اور اس طرح ان تمام اصلاحی کوششوں پر پانی پھیر دیتا ہے جو محض دھڑ کی اصلاح کے لیے کی جارہی ہوں اور جن میں نہ پیر کی طرف کوئی توجہ ہو اور نہ سر کی طرف۔

موجودہ دور میں وعظ صرف اس وجہ سے غیر مؤثر نہیں ہو گئے کہ واعظوں میں‘ اِلا ماشاء اللہ‘ کردار کی بلندی نہیں رہی۔ یہ بھی ایک سبب ہے‘ لیکن صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اگر وعظ و نصیحت سے کہیں کوئی جذبہ اُبھرتا بھی ہے تو ماحول اس کو پنپنے نہیں دیتا۔ اس لیے کہ قدم قدم پر ظلم اور تعدی ہے‘ قدم قدم پر استحصال ہے‘ قدم قدم پر ناانصافی ہے‘ رشوت ہے‘ جابرانہ رویہ اور سلوک ہے۔ پورے ماحول پر گھٹن کی فضا طاری ہے۔ تقریباً پورا نظام‘ عدل وقسط سے تہی دامن اور تہی دست ہے۔ ایسے حالات میں انسان میں جو ردِّعمل پیدا ہوتا ہے اور معاشرے کی جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس کو علامہ اقبال نے ایک شعر میں یوں تعبیر کیا ہے:

آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

اس لیے کہ وہ ماحول اور نظام اسے غذا نہیں دے رہا ہوتا۔

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!

اس ظلم و عدوان کے نتیجے میں معاشرہ منقسم ہو جایا کرتا ہے۔ مراعات یافتہ (haves) اور محروم (have nots)‘ ظالم و مظلوم اور بندہ و آقا پر مشتمل طبقات بالقوہ وجود میں آجاتے ہیں۔ ایک غیر منصفانہ نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مختلف طبقات کے لیے یہ مختلف اصطلاحات ہیں‘ لیکن ذہن میں رکھیے کہ اس مفہوم کے لیے قرآن حکیم کی اپنی اصطلاحات ہیں اور وہ ہیں مُسۡتَکۡبِرِیۡن اور مُسۡتَضۡعَفِیۡن۔ یہ دو طبقات جس معاشرے میں وجود میں آجائیں تو تباہی و بربادی اس کا مقدر ہے —— چاہے وہ کسی راستے سے اور کسی سبب سے آئے

ہوں۔ خواہ وہ سیاسی محرومی اور دباؤ (political repression) کی وجہ سے آئے ہوں‘ خواہ وہ حریت و آزادی کو سلب کرنے والے جبر و استبداد کے باعث آئے ہوں‘ خواہ معاشی استحصال (economic exploitation) کے راستے سے یہ صورت پیدا ہوئی ہو‘ خواہ وہ سماجی اور معاشرتی اونچ نیچ اور ناروا امتیازات (discrimination) کی وجہ سے وجود میں آئے ہوں اور معیارات یہ بن گئے ہوں کہ سیدزادہ بہرحال اونچا ہے خواہ وہ کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو اور دوسرے مصلّی ہیں‘ کم تر ہیں‘ خواہ وہ سیرت کے لحاظ سے کتنے بلند کیوں نہ ہوں۔ یہ برہمن اور شودر کی تقسیم یا اعلیٰ و ادنیٰ نسل کی تقسیم‘ ان تمام اسباب کی بنا پر لازماً معاشرے میں طبقات وجود میں آتے ہیں اور پھر یہ طبقات در طبقات میں تقسیم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

میں نے طبقاتی تقسیم کی رائج الوقت بیشتر اصطلاحات آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ ان کے مقابلے میں قرآن مجید کی ان دو اصطلاحات مُسْتَکْبِرِیْن اور مُسْتَضْعَفِیْن کو پیش نظر رکھیے تو قرآن کا یہ اعجاز سامنے آئے گا کہ ان دونوں اصطلاحات کی جامعیت اور گھمبیرتا یہ ہے کہ یہ رائج الوقت تمام اصطلاحات کا احاطہ کر رہی ہیں۔ ان میں مراعات یافتہ اور محروم طبقات (haves and have nots) کا تصور بھی موجود ہے‘ ان میں تمیز بندہ و آقا کا تصور بھی موجود ہے اور ان میں ظالم اور مظلوم کا تصور بھی موجود ہے۔ چنانچہ اب ذرا سنئے‘ سورۃ القصص میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ﴾ (آیت۴) ’’یقیناً فرعون نے بہت سرکشی کی تھی زمین (مصر) میں اور اُس نے تقسیم کر دیا تھا اس کے باسیوں کو گروہوں میں (اور) اس نے دبا رکھا تھا ان میں سے ایک گروہ کو۔‘‘

ظالمانہ اور غیر منصفانہ نظام کا ایک نتیجہ وہ نکلتا ہے جس کی طرف بڑی شرح و بسط کے ساتھ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے رہنمائی کی کہ انسانوں کی ایک عظیم اکثریت ڈھور ڈنگر بن جاتی ہے۔ قرآن مجید میں بھی غیر مبہم اور واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ انسانوں کی عظیم اکثریت جانوروں اور حیوانوں کی سطح تک گر جاتی ہے۔ فرمایا: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ﴾ (الاعراف: ۱۷۹) ’’اُن کے دل ہیں مگر اُن سے سمجھتے نہیں‘ اور ان کی آنکھیں ہیں لیکن اُن سے دیکھتے نہیں‘ اور ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ وہ بالکل

چوپاؤں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ اور گئے گزرے ہیں‘‘۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے ظلم و عدوان اور مستبدانہ و جابرانہ نظام کا جو انسان کی خودی کے احساس اور عزتِ نفس کو کچل دینے والی شے ہے۔ غیر عادلانہ و غیر منصفانہ نظام‘ ظلم و تعدی والا نظام exploitation and repression والا نظام آدمی میں ’’انسان‘‘ ہونے کے احساس و شعور کو مار دیتا ہے جو اس کی سیرت کی تعمیر کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر انسان ہونے کا شعور و احساس نہیں ہے تو اسے قرآن حکیم نے اس دنیا کی بہت بڑی نقد سزا سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ (الحشر: ۲۰) ’’اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو اپنے آپ سے غافل کر دیا‘‘۔ یعنی وہ اپنے ’’انسان‘‘ ہونے کے ادراک سے محروم ہو گئے تو اللہ نے بھی انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ ظاہر بات ہے کہ اپنی عظمت سے غافل انسان معاشرے میں ترفع کیسے حاصل کرے گا اور اس میں بلندی کی طرف بڑھنے کا جذبہ کیسے پیدا ہوگا؟ اسی کو شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب فلسفہ اکتشافات میں بہت صحیح لکھا ہے کہ ظلم و تعدی پر مبنی نظام کے تحت رہنے والے اکثر لوگ بالکل ڈھور ڈنگر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں اعلیٰ احساسات اور اعلیٰ جذبات کے لیے سرے سے کوئی امکان اور گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر......

اس سے بھی آگے جو بات آتی ہے‘ جس کے لیے میں آگے چل کر قرآن مجید سے استشہاد کروں گا‘ وہ یہ ہے کہ استحصالی طبقات‘ وہ لوگ جنہوں نے اپنی خدائی کا تخت جمایا ہوتا ہے‘ وہ لوگ جو معاشرے کو جونک کی طرح چوس رہے ہوتے ہیں اور عوام کی اکثریت کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہوتا ہے‘ یہ لوگ عوام الناس کو طرح طرح کے بہلاوے دے کر غافل کیے رکھتے ہیں۔ ان کے لیے طرح طرح کے مشغلے تلاش کرتے ہیں۔ وہ ذرائع ابلاغ سے لوگوں کے سفلی جذبات کو ہوا دیتے رہتے ہیں اور انہیں لہو و لعب میں مشغول رکھتے ہیں —— تقریباً اس آیت کے مصداق:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۖ وَّیَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۝۶﴾

’’اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کھیل تماشے کی چیزیں خریدتے ہیں تاکہ گمراہ کریں (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے بغیر علم کے‘ اور اس کو ہنسی بنالیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے اہانت آمیز عذاب ہے۔‘‘

اس استحصالی گروہ کی سرتوڑ کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگ کھیل تماشوں میں ہی گم‘ مگن اور مست رہیں۔ وہ سینما ہوں‘ ٹیلی ویژن کے ڈرامے اور رانگ و رنگ کے پروگرام ہوں‘ مختلف موضوعات کے اشتہارات ہوں‘ رقص و سرود کی محفلیں ہوں‘ یا وہ آرٹ کونسلیں ہوں۔ آپ دیکھئے کہ ذرائع ابلاغ پر تفریح کے نام سے ’’لہوالحدیث‘‘ کا جو طوفان آیا ہوا ہے‘ یہ سب کا سب دراصل اس لیے ہے کہ عوام الناس کو ان کے حقیقی مسائل سے گریزاں رکھا جائے۔ ان میں اپنے حقوق و فرائض کا ادراک وشعور پیدا نہ ہونے پائے۔ وہ دیکھ اور سمجھ نہ پائیں کہ وہ کس استحصالی نظام میں کولہو کے بیل کی طرح جتے ہوئے ہیں۔ اصل حقائق ان کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ وہ ان چیزوں سے بالکل غافل رہیں کہ معاشرے میں ہو کیا رہا ہے۔ کون کس پر ظلم کر رہا ہے‘ کون کس کا خون چوس رہا ہے‘ کون ان کے حقوق غصب کر رہا ہے۔ یہ سارے ہتھکنڈے علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق ہیں کہ ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری!

اور ع ’’کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں‘‘ کے مصداق انسان کے حیوانی و سفلی جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے یہ کھلونے کہیں آرٹ اور ثقافت کے نام پر دیے جائیں گے‘ کہیں مساواتِ مرد وزن کے دلفریب نظریے کی آڑ لے کر عورت کو اشتہاری اور بازاری جنس کے طور پر کھلونا بنایا جائے گا۔ چادر و چہار دیواری کا نام لے کر اسی کے تقدس کو پامال کیا جائے گا۔ لہو ولعب اور لغو وعبث مشاغل کے لیے نئے نئے دل فریب و دل آویز نام اور لیبل ایجاد کیے جائیں گے۔ یہ سب اس لیے کہ عوام الناس کی عظیم ترین اکثریت کو انہی میں مست اور مگن رکھا جائے تاکہ وہ کسی وقت بھی اصل حقائق کی طرف متوجہ ہونے ہی نہ پائیں۔

مستضعفین اور مستکبرین کا مکالمہ

یہی وہ بات ہے جس کے لیے میں نے آگے چل کر قرآن مجید سے استشہاد کا ذکر کیا تھا۔

سورۂ سبا میں قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے: ﴿یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِیْنَ۝۳۱﴾ یہ مستضعفین‘ یہ دبائے اور غافل رکھے ہوئے عوام قیامت کے دن مستکبرین سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو یقیناً ہم سیدھی راہ پر آجاتے۔ ہم بھی ایمان کی راہ‘ خیر کی راہ‘ اور عمل صالح کی راہ پر گامزن ہوتے۔ یہ تم ہی ہو جنہوں نے ہمیں راہِ راست سے روکا ہے‘ یہ تم ہی ہو جنہوں نے ہمیں مست اور مگن کیے رکھا ہے۔ اس کے جواب میں مستکبرین کیا کہیں گے‘ ذرا توجہ سے ان کا جواب سنئے —— یہ اسی نوع کا جواب ہے جو مستکبر اعلیٰ و اوّل ابلیس لعین قیامت کے دن اپنے پیروکاروں کو دے گا: ﴿وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ﴾ (ابراھیم:۲۲) کہ تم پر میرا کوئی زور تو تھا نہیں۔ میں نے تو اپنے راستے کو خوش نما دکھا کر بس تمہیں اس کی طرف بلایا تھا‘ اس دلفریب ولذت کوش راستے کو دیکھ کر دیوانے تو تم خود بنے تھے اور اس کی طرف خود لپکے تھے۔ لہٰذا جرم تمہارا اپنا ہے‘ خطا تمہاری اپنی ہے تو مجھے کیوں ملامت کرتے ہو؟ ملامت کرنی ہے تو اپنے آپ کو اور اپنے نفس امارہ کو کرو۔ بالکل یہی بات وہ مستکبرین کہیں گے: ﴿اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِیْنَ۝۳۲﴾ ’’کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روکا تھا‘ اس کے بعد کہ وہ تمہارے پاس آگئی تھی؟ بلکہ تم خود ہی مجرم تھے‘‘۔ یہ تو تمہاری اپنی شیطنت اور اپنی خباثت تھی جس کا دنیا میں ظہور ہوا ہے‘ تم خواہ مخواہ ہمیں الزام دے رہے ہو۔

اُس وقت یہ مستضعفین‘ یہ غافلین ان مستکبرین کو کہیں گے: ﴿بَلْ مَكْرُ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ﴾ (آیت ۳۳) ’’بلکہ یہ (تمہاری) رات دن کی سازشیں تھیں جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کا کفر کریں اور اس کے لیے مدِ مقابل ٹھہرائیں‘‘۔ یہ تو شب و روز کی وہ شاطرانہ اور مکارانہ چال تھی‘ جس میں تم لوگوں نے ہمیں پھانس رکھا تھا۔ یہ تمہارے ہی مشورے تھے جن کے باعث ہم نے اللہ کی نازل کردہ ہدایت کی ناقدری کی اور کفرانِ نعمت کی روش اختیار کی۔ ہم نے ان کھیل تماشوں اور باطل نظریات میں اُلجھ کر ان کو اللہ (کی محبت) کا ہمسر ٹھہرا لیا اور ہم دبے ہوئے ہونے کے باعث لہو ولعب اور باطل نظریات کے طلسم میں‘ جو تم لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے گھڑ رکھا تھا‘ گرفتار ہو کر ہم

اپنی راہ کھوٹی کر بیٹھے۔

دیکھئے ان آیات میں تین مرتبہ اِسۡتَکۡبَرُوۡا اور اُسۡتُضۡعِفُوۡا آیا ہے‘ یعنی مستکبرین اور مستضعفین کا بار بار اعادہ ہو رہا ہے تاکہ یہ اصطلاحات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔ اصل میں یہی وہ طبقاتی تقسیم ہے جو ظلم و عدوان پر مبنی اور غیر منصفانہ اور غیر عادلانہ نظام میں وجود میں آتی ہے‘ اور جب تک اس کو ختم نہیں کیا جائے گا‘ جب تک مبنی بر قسط و عدل نظام قائم نہیں کیا جائے گا اصلاحِ معاشرہ کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی تحریکوں اور کوششوں سے تھوڑے بہت اثرات پیدا ہو جائیں‘ نیچے نیچے کچھ خیر و فلاح اور کچھ بھلائی کے سوئے ہوئے جذبات کروٹ لیں‘ لیکن نتیجہ وہی نکلے گا جو علامہ اقبال کے اس شعر کے ذریعے میں آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

مستبدانہ و جابرانہ نظام اور استحصالی ماحول میں خیر و صلاح کی آرزو اوّل تو پیدا ہونی ہی مشکل ہے اور اگر پیدا ہو جائے تو ایسے معاشرے میں وہ پھل پھول اور پنپ نہیں سکتی۔ تو اس طبقاتی تقسیم کے لیے قرآن مجید کی اپنی اصطلاحات مستکبرین اور مستضعفین کا اعادہ کر کے اور ٹھونک ٹھونک کر انہیں ذہنوں میں بٹھانا مقصود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تین آیات میں ان کو تکرار و اعادہ کے ساتھ لایا گیا ہے۔

قرآن کا مرکزی پیغام: نظامِ عدل و قسط کا قیام

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ اس طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے کے لیے نظامِ عدل و قسط کا قیام ہی قرآن حکیم کی تعلیمات کا مرکزی پیغام ہے۔ نیکی کا راہبانہ تصور‘ نیکی کا علائقِ دنیا سے کنارہ کش ہونے اور نفس کشی کا وہ تصور جو عیسائیت‘ بدھ مَت اور ہندو دھرم میں ہے‘ نیکی کا وہ تصور جو تصوف کے نام سے خود ہمارے ہاں رائج ہو گیا ہے‘ جو دراصل نو افلاطونی تصوف ہے‘ ان تصورات سے ہٹ کر اسلام کا تصورِ نیکی کیا ہے اور سب سے بڑی نیکی کیا ہے؟ وہ عُروۃ الوثقٰی کون سا ہے جو نیکی کے لیے سہارا بنتا ہے؟ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ وہ ہے نظامِ عدل و قسط کا قیام۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے پہلے سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کی یہ شان بیان ہوئی ہے: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ؕ﴾ (آیت ۱۸) ’’اللہ خود گواہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور سارے فرشتے اور اہلِ علم بھی (اس پر گواہ ہیں)‘ وہ عدل و قسط کا قائم کرنے والا ہے‘‘۔ اللہ کی صفت ہے کہ وہ عادل ہے اور وہ عدل و قسط کا قائم کرنے اور نافذ کرنے والا ہے۔ اس میں بھی ایک اپیل ہے کہ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبت فی الواقع دل میں پیدا ہو گئی ہو تو ’’تَخَلَّقُوۡا بِاَخۡلَاقِ اللّٰهِ‘‘ کے مصداق اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا ایک پرتو ہم اپنے اندر بھی پیدا کریں۔

اس سے آگے چلئے‘ سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ میں (لفظی ترتیب کے فرق کے ساتھ) اہل ایمان کے لیے انتہائی زوردار انداز میں یہ مضمون وارد ہوا ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ’’اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر‘‘۔ قَوّٰمٌ‘ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہوں گے کہ عدل و انصاف کو پورے اہتمام کے ساتھ اور اپنی پوری توانائیوں اور قوتوں کے ساتھ قائم کرو۔ آیت کے اس ٹکڑے میں ﴿شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ کو ایک بالکل علیحدہ بات بھی مان سکتے ہیں‘ اس اعتبار سے کہ اللہ خود ﴿قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ﴾ ہے۔ لہٰذا اس کے لیے شہادت یہ ہوگی کہ اس کے قسط کے نظام کو اس دنیا میں قائم کیا جائے۔ جسے اقبال نے کہا ہے ؏ ’’دے تو بھی محمد ﷺ کی صداقت کی گواہی‘‘۔ تو اللہ کے ﴿قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ﴾ ہونے کی اہل ایمان کے لیے بایں طور اور بایں صورت گواہی دینا فرض ہے کہ وہ دنیا میں اس نظامِ عدل و قسط کو قائم کریں۔

سورۃ المائدۃ میں یہی مضمون ذرا سی لفظی تبدیلی کے ساتھ یوں آیا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ﴾ (آیت ۸)۔ آپ ان دونوں آیات کی لفظی ترتیب کو مدنظر رکھیں تو یہ عجیب بات معلوم ہوگی کہ ’’اللہ‘‘ اور ’’قِسط‘‘ گویا ہم معنی اور مترادف الفاظ ہیں۔ ایک جگہ حکم ہے ’’گواہ بن جاؤ اللہ کے‘‘ اور دوسری جگہ فرمایا: ’’گواہ بن جاؤ قِسط کے‘‘۔ ایک جگہ فرمایا: ’’کھڑے ہو جاؤ قِسط (عدل و انصاف) کے لیے‘‘ جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ ’’کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے‘‘۔ معلوم ہوا کہ اللہ اور قِسط کے الفاظ جو ایک دوسرے کی

جگہ آئے ہیں' آپس میں مترادف ہیں اور اس طرح دونوں کے ایک دوسرے کی جگہ آنے سے ان کے باہم لازم وملزوم ہونے کا تصور تو کم از کم سامنے آ جاتا ہے۔

بعثتِ انبیاء ورسل علیہم السلام کا مقصد

اس سے آگے چلیے' سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ پر غور کیجیے جس کی آغاز میں تلاوت کی گئی تھی۔ یہ قرآن مجید کی بڑی عظیم اور بڑی اہم آیت ہے۔ بعثِ انبیاء ورسل ﷺ کی بنیادی غرض وغایت کیا ہے؟ انزالِ کتب کا مقصد کیا ہے؟ اور اس طرح کے دوسرے بہت سے اہم سوالات کے جوابات اس آیت میں دیے گئے ہیں۔ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ایک غرض و غایت اس دنیا کے لیے ہے اور ایک غرض وغایت اُخروی ہے۔ میں اس وقت جو بات واضح کرنا چاہتا ہوں وہ بعثتِ انبیاء ورسل ﷺ اور انزالِ کتب کی اس غرض وغایت سے متعلق ہے جو اس دنیا سے تعلق رکھتی ہے جو سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں بیان ہوئی ہے۔

اب میں اس آیت کی تشریح وتوضیح کی کوشش کرتا ہوں۔ فرمایا: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ''بلاشبہ اور بالتحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا بینات کے ساتھ''۔ بَیِّن عربی زبان میں واضح اور روشن چیز کو کہتے ہیں۔ چنانچہ بَیِّنَات کو روشن دلائل بھی کہا جا سکتا ہے اور معجزات بھی جو انبیاء ورُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کو عطا کیے گئے۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ ''اور ان کے ساتھ ہم نے اتاری کتاب اور میزان''۔ یہ کتاب اور میزان کس لیے اتاری؟ اس کی غرض وغایت اور مقصد کو آیت کے اگلے حصے میں خوب کھول کر بیان کر دیا گیا: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ''تاکہ بنی نوع انسان عدل وقسط پر قائم ہوں''۔ آیت کے اس مختصر سے حصے میں بعثت انبیاء ورسل کی غرض وغایت کا لب لباب آ گیا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی رسول بھیجے تو ان کے ساتھ تین چیزیں نازل کی گئیں: (۱) بینات یعنی واضح اور روشن دلائل' معجزات' نشانیاں اور ہدایات۔ (۲) کتاب' جس میں روشن دلائل بھی ہیں اور وہ تعلیمات بھی مذکور ہیں جو انسان کی ہدایت کے لیے درکار تھیں تاکہ لوگ اس کی طرف رجوع کر سکیں۔ (۳) میزان' یعنی وہ شریعت' وہ نظام اور وہ معیارِ حق وباطل اتارا جو ٹھیک تول کر یہ بتا دے کہ انسانی معاشرے میں حقوق وفرائض کا توازن کیا ہے! افکار ونظریات میں حق کیا ہے' باطل کیا ہے! اخلاق اور دنیوی تمام معاملات میں افراط وتفریط

کے مختلف نقطہ ہائے نظر کی مختلف انتہاؤں کے درمیان عدل وانصاف اور قسط کی راہ کون سی ہے! میں عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن حکیم کا یہ مستقل اسلوب ہے کہ وہ اہم مضامین کو کم سے کم دو مرتبہ ضرور بیان کرتا ہے۔ چنانچہ کتاب اور میزان کے انزال کا ایک مرتبہ ذکر سورۃ الحدید میں آیا ہے اور یہی بات سورۃ الشوریٰ کی سترہویں آیت کی ابتدا میں فرمائی گئی: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ﴾ ''اللہ ہی ہے جس نے اتاری ہے کتاب بھی اور میزان بھی حق کے ساتھ''۔

اب غور کیجیے کہ اگر میزان نصب نہ ہو تو اس کا اتارنا' معاذ اللہ' عبث قرار پائے گا' حالانکہ سورۂ آلِ عمران میں واضح طور پر فرما دیا گیا: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ﴾ (آیت ۱۹۱) ''اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے''۔ اب یہ میزان اگر نصب نہ ہو تو بیکار ہے۔ اگر اس میں تول کر نہ دیا جا رہا ہو' جس کو بھی کچھ دیا جا رہا ہو' تو یہ ناانصافی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حقوق وفرائض کے جو ضوابط مقرر کیے ہیں اگر وہ بالفعل نافذ نہیں' تو محض ان کی تلاوت کرنے سے ثواب تو مل جائے گا' لیکن اس کی غرض وغایت تو پوری نہیں ہوگی۔ کتاب اور میزان تو نازل ہی اس لیے کی گئی ہے تاکہ بنی نوع انسان عدل وقسط پر قائم ہوں۔ سورۃ الحدید کی یہ آیت قرآن مجید کی بڑی گھمبیر آیت ہے اور اس آیت کی مکمل شرح پوری سورۃ الصف ہے۔

آگے اس آیت میں فرمایا گیا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اتارا ہے'' ﴿فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ ''اس میں جنگ کی صلاحیت ہے''۔ اس میں ظالموں کی سرکوبی اور ان کا سر کچلنے کی استعداد ہے ـــــ اسی حوالے سے سورۃ الصّف میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④﴾ ''اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں' گویا کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں'' ـــــ آگے فرمایا: ﴿وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ''اور اس (لوہے) میں لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں''۔ مثلاً اس سے گھریلو استعمال کی چیزیں توا' چمٹا وغیرہ اور بہت سی مشینیں اور بہت سے اوزار بھی بنتے ہیں جو انسان کی تمدنی ضروریات پوری کرتے ہیں' لیکن اس کی اصل قوت اسلحہ ہے اور اس میں جنگ کی صلاحیت ہے۔ یہ اس لیے ہے: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ﴾

''اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود''۔ اللہ جان لینا چاہتا ہے' یعنی ظاہر کر دینا چاہتا ہے' جانچ لینا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وہ وفادار بندے جو اس لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اس کی مدد کرتے ہیں' درآں حالیکہ وہ اس سے غیب میں ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے سامنے نہیں ہے' اس کے باوجود وہ محبت الٰہی سے سرشار ہو کر اس نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں جو اللہ نے نازل فرمایا ہے' اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں جن کی وساطت سے وہ نظام نوعِ انسانی کو عطا ہوا ہے۔ سورۃ الصف میں تو اس کے لیے براہِ راست حکم آیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ﴾ (آیت ۱۴) ''اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ''۔

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۲۵﴾﴾ ''یقیناً اللہ بہت قوت والا' بہت زبردست ہے''۔ یعنی اس کو تمہاری مدد کی قطعی حاجت نہیں۔ تم سے جو نصرت کا مطالبہ ہے' وہ تمہارے امتحان کے لیے ہے' جس کی بنا پر تم عدالتِ اُخروی میں سرخرو ہو گے۔

بعثتِ محمدی ﷺ کی غرض وغایت

سورۃ الحدید کی آیت میں تو ایک قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ لیکن اس کے جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر خصوصی انطباق (particular application) کے متعلق سورۃ الشوریٰ کی پندرہویں آیت میں ذکر کیا گیا ہے جس کی میں نے آغاز میں تلاوت کی تھی' فرمایا کہ: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ﴾ ''اے (محمد ﷺ!) آپ اسی — ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ۭ﴾ (آیت ۱۳) ''کہ قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو'' — کی دعوت دیتے چلے جایئے اور جمے رہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان (متکبرین' معاندین' مخالفین' اور کفار ومشرکین) کی خواہشات کی پیروی (اور پروا) ہرگز نہ کیجیے''۔ ﴿قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ﴾ ''آپ برملا کہہ دیجیے کہ میرا یقین تو اس کتاب پر ہے جو اللہ نے نازل فرمائی ہے''۔ ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ۭ﴾ ''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مابین (نظام) عدل قائم کروں''۔ یعنی مجھے محض ایک واعظ نہ سمجھ لینا' محض ایک مبلغ نہ خیال کر لینا جو ایک وعظ کہہ کے اور کچھ تبلیغ کر کے تحسین کے ڈونگرے وصول کرتا ہے

اور پھر اگلی بستی کی راہ لیتا ہے۔ اگر تم اس مغالطے میں مبتلا ہو تو اسے دور کرو۔ چونکہ تم نے حقیقت نفس الامری کا ادراک کیا ہی نہیں' اس لیے اب اچھی طرح جان لو کہ میری بعثت کا تکمیلی مقصد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین (المیزان) یعنی نظام عدل وقسط بالفعل قائم ونافذ کروں۔ میں اس بات پر مامور من اللہ ہوں کہ ظالم کا ہاتھ روک دوں' مظلوم کی فریاد رسی کروں۔ نظامِ زندگی کو عدوان اور استحصال سے پاک صاف کروں اور وہ نظامِ عدل وقسط برپا کروں جس میں جس کو جو کچھ ملے عدل وانصاف کے مطابق ملے' اور کوئی شخص اور کوئی طبقہ کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کر سکے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا یہ تکمیلی مقصد قرآن حکیم میں ایک دوسرے اسلوب سے ایک شوشے کے تغیر کے بغیر قرآن حکیم کی تین سورتوں (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹) میں بایں الفاظ واضح فرمایا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر''۔ غور فرمایئے سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ اور سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۷ دونوں کا جامع ومانع اسلوب کے ساتھ اس آیت مبارکہ میں ذکر آ گیا۔ بعثت رسول کا ذکر بھی موجود ہے۔ ''کتاب'' کی جگہ ''ھُدًی'' کا لفظ آ گیا جو کتابِ الٰہی کا ایک توصیفی نام ہے۔ المیزان اور نظام عدل وقسط کی جگہ ''دین الحق'' کی اصطلاح آ گئی جو اس ضمن میں قرآن مجید کی جامع ترین اصطلاح ہے جس میں وہ تمام مفاہیم بھی شامل ہیں جو المیزان' اور عدل وقسط کی تشریح وتوضیح میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ الغرض ﴿لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ اور ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ۭ﴾ کے جملہ مفاہیم ﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ میں آ گئے۔

(جاری ہے)

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

قاریٔ قرآن کے امکانی سوالات اور ان کے جوابات

پروفیسر عبداللہ شاہین☆

اِنَّ الحمد للہ والصّلوات والسَّلام علٰی رسول اللہ —— اما بعد!

قرآن حکیم جو اللہ' احکم الحاکمین کی طرف سے آخری کتابِ ہدایت اور حتمی و قطعی احکامات (final commandments) کا مجموعہ ہے' اس کو سمجھ کر پڑھنا پڑھانا اور دوسروں تک پہنچانا ہمارے ذمہ ہے۔ البتہ اس کے بعض مضامین نازک ترین اور چند مقامات مشکل اور دشوار گزار ہیں جن کو عرفِ عام میں ''بال سے باریک اور تلوار سے تیز'' کی ضرب المثل کے مصداق کہا جا سکتا ہے اور ان کا مکمل فہم حاصل کیے بغیر قرآنی حکمت کو آسانی سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ لہٰذا ذیل میں ان مضامین اور مقامات کا بیان اور اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔

محترم قارئین ! قرآن مجید کی ''ترتیب نزولی'' اور ہے اور موجودہ مصحف قرآن کی ترتیب کچھ اور ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کی موجودہ کتابی ترتیب میں مدنی سورتیں پہلے ہیں جبکہ وہ بعد میں نازل ہوئی ہیں اور مکی سورتیں بعد از اں ہیں جن کا نزول پہلے ہوا تھا (اگرچہ یہ بھی حکمت سے خالی نہیں' کیونکہ مدنی سورتوں میں معاشرتی و معاشی عملی مسائل کا بیان ہے اور مکی سورتوں میں نظریاتی مباحث ہیں)۔ لہٰذا مضامین قرآن کو سیاق وسباق یعنی پورے قرآن مبین میں جہاں جہاں متعلقہ مضامین کا بیان ہے' ان سب کو ملا کر پڑھنے سے ہی بیان کردہ مسائل کا مکمل فہم حاصل ہوتا ہے' وگرنہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے ایک عام قاری کے ذہن میں چند سوالات پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ بعض وسوسوں' اشکالات (reservations) اور ذہنی الجھنوں کا شکار ہو سکتا ہے۔

☆ ریٹائرڈ ایسوسی ایٹ پروفیسر' فون 0324-6454124

کفار کے دل و دماغ پر مہر لگانے کی حقیقت

اس تناظر میں دیکھئے کہ پہلے ہی پارہ میں ﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِھِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِھِمۡ ؕ وَعَلٰۤی اَبۡصَارِھِمۡ غِشَاوَۃٌ ﴾(البقرۃ:۷) ''اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑا ہوا) ہے'' کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ شیطانی ونفسانی وسوسہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب اللہ احکم الحاکمین نے خود ہی کافروں اور منافقوں کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی تو ان کا کیا قصور؟ مگر قاریٔ قرآن جب اسی نفس مضمون کو قرآن حکیم کے دیگر مقامات اور دوسری آیات کے ساتھ ملا کر پڑھے گا تو واضح ہو جائے گا کہ مہر لگنے کا مرحلہ ان کے اپنے اقدام ﴿......وَقَوۡلِھِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ﴾ (النساء:۱۵۵) ''......ان کے یہ کہنے کے سبب کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں'' اور ﴿...... قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَعَصَیۡنَا ٭﴾ (البقرۃ:۹۳) ''...... کہنے لگے ہم نے حکم ربی سن تو لیا مگر مانیں گے نہیں'' کے نتیجہ کے طور پر قانونِ قدرت کے تحت پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے کوئی یک طرفہ کارروائی نہیں کی' ﴿...... بَلۡ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیۡھَا بِکُفۡرِھِمۡ﴾ (النساء:۱۵۵) ''...... بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں کی صلاحیت قبولِ حق ماند ہونے دی۔''

گویا ان کے کفریہ طرزِ عمل' مسلسل غفلت اور اغماضِ حق کے ردّعمل اور ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے'' کے قانونِ مکافاتِ عمل کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ کیونکہ ﴿لَھُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَھُوۡنَ بِھَا ۫﴾ ''اللہ نے ان کو دل و دماغ دیے مگر انہوں نے سوچ و بچار سے کام نہیں لیا'' ﴿وَلَھُمۡ اٰذَانٌ لَّا یَسۡمَعُوۡنَ بِھَا ؕ﴾ ''اور اللہ نے انہیں کان دیے مگر انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔'' ﴿وَلَھُمۡ اَعۡیُنٌ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ بِھَا ۫﴾ (الاعراف:۱۷۹) ''اور اللہ نے ان کو آنکھیں دیں مگر انہوں نے چشم پوشی سے حقائق ازلی کو نظر انداز کیا''۔ پس اس اغماض برتنے پر قانونِ عمل و ردّعمل (action & re-action) حرکت میں آیا اور ﴿فَلَمَّا زَاغُوۡۤا﴾ ''جب وہ ٹیڑھ پن پر جمے رہے تو'' ﴿اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوۡبَھُمۡ ؕ﴾ (الصف:۵) ''اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا ہونے دیا'' اور یہی وہ مرحلہ اور کیفیت ہے' جس کو سورۃ الانفال میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوۡلُ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَقَلۡبِہٖ﴾ (آیت ۲۴) ''اور جان لو کہ اللہ بندے اور اس کے دل کے مابین حائل ہو جایا کرتا ہے''، یعنی مسلسل گناہوں کے سبب جب انسان کا دل سیاہ ہو جاتا ہے تو اللہ

بھی اسے اپنی توجہات کے انوار وتجلیات سے محروم کر دیتا ہے۔ پیش نظر رہے کہ یہ بھی فرمانِ الٰہی ہے کہ جو بھلائی کی راہ چلنا چاہے: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷﴾ ''ہم اُس کے لیے اچھائی آسان کر دیں گے'' اور جو بدی کا راستہ اختیار کرنا چاہے: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝۱۰﴾ (اللیل) ''ہم اسے برائی کی ڈھیل دے دیں گے''۔ کیونکہ آئین باری تعالیٰ ہے: ﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى﴾ (النساء: ۱۱۵) ''ہم اسے اسی طرف کی ڈھیل دیں گے' جس طرف وہ جانا چاہے۔''

معافی اور سزا کا دارومدار

اسی طرح قاریٔ قرآن جب ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ ...... فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ﴾ (البقرۃ: ۲۸۴) ''اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے...... پس وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے'' کی عبارتِ قرآنی پڑھتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب معافی اور سزا' اللہ کی مرضی پر موقوف ہے تو بھلائی کرنے اور برائی سے بچنے کا کیا فائدہ؟ پھر تو یہ جاں گسل جدوجہد سعیٔ لاحاصل ہے! — مگر جب وہ ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ﴾ (النساء: ۱۴۷) ''اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم اُس کا شکر کرو اور اُس پر ایمان لاؤ!'' کا مطالعہ کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ ''جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے'' کا بیان' اللہ کی قدرت' طاقت اور اختیاراتِ مطلق کا اظہار ہے۔ چنانچہ ﴿وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۸۴﴾ (البقرۃ) ''بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ کر گزرنے کی قدرت وطاقت رکھتا ہے'' کے تکمیلی الفاظ کی ''حکمت'' یہی ہے کہ اگرچہ وہ سبھی کچھ کرسکتا ہے لیکن وہ ''ظالم'' نہیں کہ بلاوجہ کسی کو سزا دے اور ''ناانصاف'' بھی نہیں کہ زیادتیاں کرنے والوں کو یوں ہی معاف کر دے بلکہ ''اَلْعَادِل'' ہے' لہٰذا ''جزا وسزا'' جو کچھ بھی ہوگا' عدل وقسط کے قانونِ قدرت کے مطابق ہی ہوگا۔ اگر سزا ہوگی تو ناشکرے پن اور کفر وشرک کے باعث ہوگی' وگرنہ اللہ کی سلطنت اندھیر نگری یا اندھے کی لاٹھی (blind power) نہیں (نعوذ باللہ!) کہ جسے لگ گئی' لگ گئی!

چنانچہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں بھی ﴿اِنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ﴾ ''اگر اللہ چاہے'' اور ﴿مَاشَاۗءَ اللّٰهُ﴾ ''جو اللہ چاہے'' کا بیان ہے' اسی پس منظر میں اس کو پڑھنا اور اسی مفہوم میں اسے سمجھنا

ہوگا — اسی بات کو نہ سمجھ کر پچھلی قومیں صراطِ مستقیم سے محروم رہیں۔ چنانچہ: ﴿قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۤ﴾ (یٰسٓ: ۴۷) ''کافر (محتاج) مؤمنوں کے بارے میں کہتے ہیں بھلا ہم ان کو کھانا کھلائیں' جن کو اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟'' یعنی جب فی سبیل اللہ کھانا کھلانے کی ترغیب دی جاتی تو کافر بے ایمان مذکورہ بالا حجت بازی کرتے۔ حالانکہ مشاہدۂ عام ہے کہ اسباب کی حد تک انسان خود گوندھ پکا کر روٹی کھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود کسی کے منہ میں نوالا نہیں ٹھونستا۔

ایمان اور شرک کا مبنی بر مشیتِ الٰہی ہونا

اسی طرح مشرکینِ عالم نے بھی دلیل بازی کی کہ ﴿لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَاۗؤُنَا﴾ (الانعام: ۱۴۸) ''اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہی ہمارے آباء واجداد ایسا کرتے'' — تو اللہ تعالیٰ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ: ﴿وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا﴾ (الانعام: ۱۰۸) کہ اگر اللہ چاہتا تو واقعی وہ شرک نہ کر سکتے' کیونکہ اللہ احکم الحاکمین ہے اور تمام طاقتوں کا مالک ہے' مگر زبردستی کرنا اُس کی حکمت تدبیر کے خلاف ہے۔ اگر وہ اپنی مرضی کرنا چاہتا تو کافروں اور مشرکوں کو نکیل ڈالتا۔ نیز اگر اختیار اور ارادہ کی آزادی دے کر انسان کو فاعل مختار نہ بناتا' جیسا کہ سورۃ الکہف میں ہے: ﴿فَمَنْ شَاۗءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاۗءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (آیت ۲۹) ''پس جو چاہے مؤمن بن جائے اور جو چاہے کافر رہے'' تو پکڑ کر سیدھے راستے پر چلاتا — مگر اس طرح ایمان والے شاباش کے حق دار کیسے بنتے؟ اور ﴿لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝۷﴾ (الکہف) ''تاکہ ان کو آزمائے کہ ان میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے!'' کے تقاضے کیسے پورے ہوتے؟ — الغرض انہوں نے اصلاً اللہ کی ''مَشِیئت'' (اللہ کی رضا اور چاہت) اور اللہ کے ''اِذن'' (اللہ کی طرف سے رخصت' مہلت اور کھلی چھٹی) کے مفہوم کو ناسمجھی میں گڈمڈ کر دیا۔ حالانکہ اللہ جل جلالہ نے اپنی چاہت' رضا اور خوشی کو تو صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ بقولہٖ تعالیٰ ﴿لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ۭ﴾ (الزمر: ۷) ''وہ بندوں کی طرف سے کفر پر راضی نہیں' اور اگر شکر کرو گے تو وہ اسے تمہارے لیے پسند کرے گا'' — اور ''اِذن'' یہ ہے کہ اس نے انسان کو ارادہ اور اختیار کے ساتھ پیدا کیا۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ (الدھر) ''اب چاہے وہ شکر

گزار بنے چاہے ناشکرا‘‘ کسی پر کوئی زبردستی نہیں‘ بلکہ بقولہٖ تعالیٰ: ﴿وَاُمْلِیْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ۝۴۵﴾ (القلم) ’’میں ان کو ڈھیل دیتا ہوں‘ (کیونکہ) میری حکمت عملی خوب ہے‘‘۔ اگر ’’جبر‘‘ کرنا ہوتا تو اللہ عزوجل انبیاء ورسل ؑ کو نہ بھیجتا‘ آسمانی کتابیں نازل نہ کرتا‘ سامنے آ کر سب کو عبادت و اطاعت کا حکم دیتا تو کس کی مجال تھی کہ دَم بھی مار سکتا! لیکن مارے باندھے کی اطاعت مطلوب نہیں‘ وگرنہ تو ایک پتا بھی اُس کی مرضی کے خلاف ہل نہیں سکتا‘ لہٰذا اُس کے ’’اِذن‘‘ کو اُس کے حکم یا اجازت سے تعبیر نہیں کرنا چاہیے جیسے کہ ہمارے ہاں ہر واقعہ کے بارے میں کہہ دیتے ہیں ’’اللہ کو یہی منظور تھا‘‘ حالانکہ سب کام اللہ کے پسندیدہ نہیں۔ مثلاً ایک چور چوری کرتا ہے تو یہ اُس کا اپنا فعل ہے‘ وگرنہ اللہ تعالیٰ نے تو چور کا ہاتھ کاٹنے کا قانون جاری کیا ہوا ہے۔ تاہم اس نے مہلت اور ڈھیل دے رکھی ہے کہ ﴿اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ ۟﴾ (الزمر:۷) ’’اگر انکار کی روش اختیار کرتے ہو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے۔‘‘ اُسے تمہاری کوئی پروا نہیں‘ دفع ہو جاؤ‘ جو مرضی کرتے پھرو! آنا تو اُسی کے پاس ہے‘ پھر وہ تم سے پوچھ لے گا۔

کیا کچھ آیاتِ قرآنی رسول اللہ ﷺ کو بھلادی گئیں؟

یہاں یہ وضاحت کر دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ’’مَا شَآءَ اللّٰهُ‘‘ کے اسی دائرۂ اختیار کو پیش نظر نہ رکھ کر غیروں کے اعتراضات کے ساتھ ’’اپنوں‘‘ سے بھی تسامح ہوسکتا ہے۔ مثلاً سورۃ الاعلیٰ کی آیات ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۝۶ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ (آیت ۷) ’’(اے نبی ﷺ!) ہم آپ کو قرآن پڑھائیں گے تو آپ اسے بھولیں گے نہیں‘ مگر جو اللہ چاہے۔‘‘ کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی مسلمان کو یہ وہم نہ ہو جائے کہ شاید اللہ تعالیٰ نے پہلے کچھ آیات نازل کر دی ہوں اور بعد ازاں وہ نبی کریم ﷺ کو بھلا دی ہوں‘ یا یہ کہ مبادا موجودہ قرآن پورا نہیں ہے‘ پہلے اس کے پارے زیادہ تھے اب کم ہو کر تیس رہ گئے ہیں (نعوذ باللّٰہ من ذٰلک)۔ جبکہ ہرگز ہرگز ایسا نہیں‘ بلکہ یہ شیطانی وسوسہ اور فتنہ ہوسکتا ہے‘ کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ﴿لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَى ۝۵۲﴾ (طٰہٰ) کہ رب تعالیٰ بھول چوک سے پاک ہے‘ نہ بھولتا ہے‘ نہ چوکتا ہے— ایسا نہیں کہ پہلے قرآن نازل کر بیٹھا اور پھر کچھ آیات یا سورتیں واپس لے لیں ہوں (العیاذ باللہ!) بلکہ یہاں ﴿اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ﴾ متکلم کے اختیارِ مطلق کا بیان ہے‘ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ۝۸۶﴾ (بنی اسرائیل)

’’اگر ہم چاہیں تو جو وحی ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں‘ اسے محو کر دیں اور پھر تم ہمارے مقابلے میں کسی کو مددگار نہ پاؤ‘‘۔

ایسی ہی مثال سورۃ الاعراف میں موجود ہے:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ﴾ (آیت ۸۸)

’’ان کی قوم کے متکبر سردار کہنے لگے کہ اے شعیب! ہم تمہیں اور تمہارے ہمراہ ایمان لانے والوں کو اپنے شہر سے نکال دیں گے یا یہ کہ تم ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ!‘‘

تو شعیب ؑ نے جواباً فرمایا:

﴿مَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ﴾ (الاعراف:۸۹)

’’ہمیں یہ شایاں نہیں کہ ہم اس (تمہارے مذہب) میں لوٹیں (جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات بخش چکا ہے) لیکن یہ کہ اگر اللہ‘ ہمارا رب چاہے!‘‘

اور سورۃ الانعام میں ہے کہ جب ابراہیم ؑ کو ان کی قوم نے اپنے خود ساختہ معبودوں سے ڈرایا‘ دھمکایا تو آپؑ نے ببانگ دہل فرمایا:

﴿وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ﴾ (الانعام:۸۰)

’’اور میں ان سے نہیں ڈرتا جنہیں تم اُس (اللہ) کے ساتھ شریک بناتے ہو‘ البتہ میرا رب جو کچھ چاہے۔‘‘

مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ کی ’’قوتِ قادرہ‘‘ کا بیان ہے‘ وگرنہ اللہ تعالیٰ کیونکر چاہے گا کہ پہلے پیغمبر اسلام ﷺ پر وحی نازل کرے‘ پھر ان کے سینے سے محو کر دے یا واپس چھین لے۔ اسی طرح وہ کبھی پسند نہیں کر سکتا کہ اپنے منتخب کیے ہوئے پیغمبر شعیب ؑ کو قوم کے مذہب باطل کی طرف راغب ہونے دے جبکہ شعیب ؑ اپنی قوم کو اسی مذہبِ باطل کو ترک کرنے اور توحید خالص کو اپنانے کی دعوت دیتے رہے۔ نیز وہ یہ بھی نہیں چاہے گا کہ اُس کے اولوالعزم پیغمبر ابراہیم ؑ (خلیل اللہ) مشرکوں کے جھوٹے معبودوں سے ڈرنے لگیں۔ پس یہ اللہ کے لامتناہی اختیارات کا بیان ہے‘ امر واقعہ نہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت —— ’’شَآءَ اللّٰہُ‘‘ کے بارے میں درجِ ذیل آیات کا مطالعہ بھی اسی تناظر میں کرنا چاہیے:

﴿كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ (المدثر)

’’کچھ شک نہیں کہ یہ نصیحت ہے۔ تو جو چاہے اسے یاد رکھے۔ اور یاددہانی بھی تب ہی ہوگی جب اللہ چاہے۔‘‘

﴿اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ (الدھر: ۳۰)

’’یہ تو ایک نصیحت ہے‘ پس جو چاہے اپنے رب کی طرف پہنچنے کا راستہ اختیار کرلے۔ اور تم نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ نہ چاہے۔‘‘

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (التکویر)

’’یہ تو جہان بھر کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے‘ اُس کے لیے جو سیدھی راہ چلنا چاہے۔ اور تم نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو اللہ چاہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔‘‘

ان آیات میں بھی مشیتِ باری تعالیٰ ہی کا بیان ہے‘ جسے نہ سمجھ کر ذہنی الجھاؤ پیدا ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو کہہ دیا کہ ’’جو تم میں سے چاہے......‘‘ اور دوسری طرف کہا: ’’جب تک اللہ نہ چاہے......‘‘ تو ذہن میں آسکتا ہے کہ سب کچھ اللہ کررہا ہے‘ ہم تو بے گناہ ہیں۔ لہٰذا قرآن کو سمجھنے کے لیے ’’اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ‘‘ کو سمجھنا پڑتا ہے۔ یعنی یہ اللہ کی طاقت اور اختیارِ مطلق کا بیان ہے‘ وہ چاہے تو یوں اور یوں بھی کرسکتا ہے مگر ضروری نہیں کہ ایسا کرے بھی!

ہدایت وگمراہی کی حقیقت

قرآن مجید میں متعدد جگہ ﴿يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (المدثر: ۳۱) یا اس سے ملتے جلتے الفاظ موجود ہیں۔ تو ان کو بھی ’’مشیتِ الٰہی‘‘ کی روشنی میں سمجھنا چاہیے کہ یہ اللہ کے اختیارِ مطلق کا بیان ہے اور اس کے ترجمہ ’’اللہ ربّ العزت جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے‘‘ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ’’جسے چاہتا‘ گمراہ کرتا! اور جسے چاہتا‘

ہدایت دیتا!‘‘ (اگر جبر ہوتا) مگر وہ زبردستی کرتا نہیں‘ کیونکہ اُس نے جن وانس کو خود مختار بنایا ہے۔ لہٰذا سورۂ یونس میں یہ قانون جاری فرمایا کہ:

﴿فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ﴾ (آیت ۱۰۸)

’’پس جس نے ہدایت اختیار کی تو یقیناً اس کی ہدایت کا فائدہ اُسی کو ہے‘ اور جو گمراہ ہوا تو بلاشبہ اُس کی گمراہی کا وبال اُسی پر ہے۔‘‘

اور اسی قاعدۂ کلیہ کو مؤکد کرنے کے لیے سورۂ بنی اسرائیل میں بارِ دگر فرمایا:

﴿مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ﴾ (آیت ۱۵)

’’جو شخص ہدایت اختیار کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لیے ہدایت اپناتا ہے‘ اور جو گمراہ ہوتا ہے تو گمراہی کا ضرر بھی اسی کو ہوگا۔‘‘

پس اللہ جل جلالہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ البتہ یہ تو ابلیس مردود کا زعم باطل تھا کہ اولاً خود اس نے اپنی آزاد مرضی‘ اختیار اور ارادہ سے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی اور آدم علیہ السلام کو سجدۂ تعظیمی کرنے سے انکار کردیا مگر بعدازاں اپنی گمراہی کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف منسوب کردیا اور اس پاک ذات پر بہتان باندھتے ہوئے کہنے لگا: ﴿بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ﴾ (الحجر: ۳۹) ’’چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے‘‘ —— جبکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ اتنا مہربان ہے کہ ہدایت کے طالبوں کو ضرور ہدایت دیتا ہے۔ چنانچہ بار بار فرمایا: ﴿يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝﴾ (الرعد) ’’جو بھی اس کی طرف رجوع کرتا ہے‘ اسے ضرور اپنی طرف کا راستہ دکھاتا ہے‘‘۔ ﴿يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝﴾ (الشوریٰ) ’’جو اُس کی طرف متوجہ ہو اسے ضرور ہدایت دیتا ہے‘‘۔ ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ﴾ (العنکبوت: ۶۹) ’’اور جن لوگوں نے ہمارے لیے جدوجہد کی ہم اُن کو ضرور اپنے راستے دکھادیں گے‘‘۔ بلکہ اُس کی عنایات‘ الطاف‘ نوازشات اور کرم اس قدر ہے کہ مزید فرمایا: ﴿وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ﴾ (مریم: ۷۶) ’’اور اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ کی ہدایت میں اضافہ کرتا اور ہدایت کی راہیں کشادہ کرتا چلا جاتا ہے‘‘۔ لیکن فاسقوں اور ظالموں کو بالجبر ہدایت نہیں دیتا۔ اگر ایسا ہی کرنا ہوتا تو تمام طاقتوں کا مالک ہونے کے باوجود ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (العنکبوت) ’’کاش وہ جان لیتے!‘‘ اور ﴿لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝﴾ (التوبۃ) ’’کاش وہ عقل سے کام لیتے!‘‘ جیسا صیغہ تمنائی استعمال نہ کرتا‘ کیونکہ وہ بے بس تو نہیں ہے‘ بلکہ ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝﴾

(الانعام) ''وہ اپنے بندوں پر پورا پورا قابو رکھتا ہے' اور وہ حکمت والا اور خبر رکھنے والا ہے۔'' یعنی سب سے بڑھ کر اور سب سے بڑا دانا ہے کہ بخوبی جانتا ہے' کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے اور کون سا کام کب' کہاں' کیسے اور کیونکر کرنا چاہیے! نیز ''اَلۡخَبِیۡرُ'' بھی ہے یعنی ''ما کان وما یکون'' کا علم بھی رکھتا ہے۔ اس کے باوجود آرزو' تمنا اور خواہش کا اظہار کر رہا ہے کہ کاش! کافر عقل و سمجھ اور سوجھ بوجھ سے کام لیتے تو ضرور بالضرور صراطِ مستقیم کو پا لیتے۔

یہاں یہ اہم پہلو بھی ذہن نشین رہے کہ کبھی کبھی وہ اپنی ''هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ'' کی قوتِ قاہرہ اور شانِ جلالی کا مظاہرہ بھی کرتا ہے کہ اگرچہ وہ ''اَلۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ'' عام طور پر بندوں کے کاموں میں دخل نہیں دیتا' لیکن ان کے معاملات کا آخری اور حتمی اختیار (ultimate authority) اُسی کے پاس ہے۔ وگرنہ تو ہر کوئی اپنا اپنا ارادہ پورا کرنا شروع کر دیتا اور کائنات میں فساد اور ابتری پھیل جاتی۔ چنانچہ جب چاہتا ہے موقع و محل کی نسبت سے حکمت و دانائی پر مبنی اپنے محفوظ استحقاقی اختیارات (reserve discretionary powers) استعمال کرتا ہے اور ''نہیں'' (No) کہہ کر ان کے ارادوں کو توڑ دیتا ہے' کیونکہ قوانین قدرت جاری کر دینے کے بعد (نعوذ باللہ) اس کے ہاتھ بندھ نہیں گئے کہ اپنے بنائے ہوئے فطری قوانین (natural laws) کو معطل یا منسوخ نہ کر سکے۔ اس کی ایک مثال سورۃ الانبیاء آیت ۶۹' ۷۰ میں موجود ہے' جب کافر قوم نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے بہت بڑے الاؤ میں ڈال کر جلانا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے شعلہ زن آگ سے ﴿یٰنَارُ کُوۡنِیۡ بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ ﴿ۙ۶۹﴾﴾ (الانبیاء) ''اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی والی ہو جا (میرے خلیل) ابراہیم پر'' کہہ کر آگ کی جلانے کی فطرت و صلاحیت کو سلب کر لیا اور ﴿وَ اَرَادُوۡا بِہٖ کَیۡدًا فَجَعَلۡنٰہُمُ الۡاَخۡسَرِیۡنَ ﴿ۚ۷۰﴾﴾ (الانبیاء) ان کے زبردست تدبیری ارادوں کو ناکام بنا دیا۔

مزید برآں قرآن حکیم کے چند اور مقامات بھی بڑے اہم ہیں' جنہیں واضح کرنا قرآن فہمی کے لیے یقیناً مفید ہے' جو درج ذیل ہیں:

خیر و شر کی حقیقت

سورۃ النساء کی آیات ۷۸ اور ۷۹' جن میں ''خیر'' اور ''شر'' کی حقیقت کا بیان ہے وہاں پہلے فرمایا: ﴿کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ﴾ یعنی دونوں پہلو ایک اللہ کے ہی پیدا کردہ ہیں۔ یہ نہیں کہ

''خیر'' کا خالق اور ہے اور ''شر'' کا خالق کوئی اور۔ جیسا کہ زردشت کے پیروکاروں اور پارسیوں کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ فرمانِ ربانی ہے: ﴿وَ قَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اِلٰـہَیۡنِ اثۡنَیۡنِ ۚ﴾ ''اور فرمایا اللہ نے' دو معبود نہ بنا لینا'' بلکہ ﴿اِنَّمَا ہُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ (النحل:۵۱) ''یقیناً معبود وہی ایک ہی ہے''۔ چنانچہ ہر شے کا خالق اکیلا اللہ ہی ہے۔ دھوپ' چھاؤں' گرمی' سردی سب اُسی کی بنائی ہوئی ہے۔ مگر خیر اور شر کا ''کاسب'' (یعنی اختیار کرنے والا) خود انسان ہے۔ چاہے تو دھوپ میں کھڑا ہو اور چاہے تو چھاؤں میں جا بیٹھے۔ چاہے نفع بخش چیز کو اپنا لے اور چاہے تو ضرر رساں اور نقصان دہ کو اختیار کر لے۔ اسی لیے بعد ازاں فرمادیا: ﴿مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ ؕ﴾ (النساء:۷۹) کہ جو بھی ضرر تمہیں پہنچتا ہے' وہ تمہارے کرتوت کے باعث اور تمہارے نفوس کی کمائی ہے' البتہ ﴿مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ ۫﴾ (النساء:۷۹) کہ جو بھی خیر' نفع اور بھلائی ہے' وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے' کیونکہ اس کے ہاتھ میں خیر ہی خیر ہے۔ لہٰذا ''شر'' کی نسبت اس کی طرف کی ہی نہیں جا سکتی' کیونکہ وہ ''سُبۡحٰن'' ہے' یعنی ہر عیب' نقص اور کمی سے پاک ہے۔

قرآن مجید میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا بیان بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الشعراء آیات ۷۸ تا ۸۲' جہاں انہوں نے ''ربّ العالمین'' کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ ''وہی ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی میری رہبری فرماتا ہے۔ وہی ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے''۔ مگر آگے یہ نہیں کہا کہ ''جو مجھے بیمار کرتا اور شفا دیتا ہے'' بلکہ فوراً انداز بدلا اور عرض گزار ہوئے: ﴿وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَہُوَ یَشۡفِیۡنِ ﴿۪ۙ۸۰﴾﴾ ''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا عطا فرماتا ہے''۔ یعنی ''بیماری'' (جو تکلیف دہ چیز ہے) اُس کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور ''شفا'' (جو آرام دہ چیز ہے) اُس کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف کی ہے — (پس انہی آیات کی روشنی اور مفہوم میں ہمارے ہاں پڑھے جانے والے ''ایمانِ مفصل'' کے اس جملے ''وَالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی'' کو سمجھنا چاہیے۔)

دوزخ اور جنت کا دوام

بعض حضرات کو سورۂ ہود کی حسب ذیل آیات سے ایک مغالطہ لاحق ہوا ہے' جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاَمَّا الَّذِیۡنَ شَقُوۡا فَفِی النَّارِ لَهُمۡ فِیۡهَا زَفِیۡرٌ وَّ شَهِیۡقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ﴿۱۰۷﴾﴾ (ھود)

”تو جو بدبخت ہوں گے‘ وہ دوزخ میں ہوں گے جس میں انہیں چیخنا اور دھاڑنا ہے۔ جب تک آسمان اور زمین ہے‘ اسی میں رہیں گے‘ سوائے اس کے جو تمہارا رب چاہے۔ بے شک تمہارا رب جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔“

ان آیات میں مذکور زمین وآسمانِ دنیا مراد نہیں‘ جنہیں توڑ پھوڑ دیا جائے گا‘ بلکہ عالم آخرت کے زمین وآسمان ہیں جن کا بیان یوں ہے: ﴿یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمٰوٰتُ﴾ (ابراھیم:۴۸) ”جس دن یہ زمین (دنیا) دوسری زمین (آخرت) سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی (بدل دیے جائیں گے)۔“

پس یہ بات تو سب پر واضح ہے‘ البتہ ”سوائے اس کے جو تیرا رب چاہے“ اور ”بے شک تمہارا رب جو چاہتا ہے کر دیتا ہے“ کے الفاظ سے کچھ عقلیت پسند اہل ظواہر کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے یہ مفہوم نکال لیا کہ جہنمیوں کا عذاب لامتناہی نہیں ہوگا بلکہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر آخر نجات پا جائیں گے اور یہ رائے بعض ائمہ نے بھی اختیار کر لی کہ آخر کار جہنم خالی ہو جائے گی‘ اس کے اندر کوئی نہ رہے گا اور خالی ہو جانے کے باعث اس کے دروازے کھڑکھڑائیں گے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ہے کہ دوزخیوں سے کہا جائے گا: ﴿فَادۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ﴾ (النحل:۲۹) ”پس داخل ہو جاؤ دوزخ کے دروازوں میں سے‘ رہو گے اس میں ہمیشہ“۔ پھر فرمایا: دوزخی‘ دوزخ سے نکلنا تو چاہیں گے لیکن: ﴿كُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَا مِنۡ غَمٍّ اُعِیۡدُوۡا فِیۡهَا ٭ وَ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ﴿۲۲﴾﴾ (الحج) ”جب بھی وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں تو اسی میں لوٹا دیے جائیں گے کہ جلنے کا مزہ چکھتے رہو“۔ نیز فرمایا: ﴿كُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَاۤ اُعِیۡدُوۡا فِیۡهَا وَ قِیۡلَ لَهُمۡ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ ......﴾ (السجدۃ:۲۰) ”جب بھی چاہیں گے کہ اس میں سے نکل جائیں تو اسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ اس آگ کے عذاب کا مزہ چکھتے رہو......“

نیز دوزخ سے نکلنا تو کجا اہلِ جہنم کا تو عذاب بھی ہلکا یا کم نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ

فرمایا: ﴿لَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمۡ مِّنۡ عَذَابِهَا ؕ﴾ (فاطر:۳۶) ”ان کا عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا“ اور عذاب کی کمی کا تو کیا سوال؟ انہیں تو مہلت بھی نہیں دی جائے گی: ﴿لَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَ لَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (البقرۃ) ”ان کا عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وقفہ بھی نہیں دیا جائے گا“۔ غرضیکہ دوٹوک فرما دیا گیا: ﴿یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمۡ بِخٰرِجِیۡنَ مِنۡهَا ۫ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ ﴿۳۷﴾﴾ (المائدۃ) ”وہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نکل نہ سکیں گے‘ اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے کا عذاب ہے۔“

مذکورہ بالا قرآنی آیات کے باوجود بعض نکتہ وروں نے یہ لفظی باریکی تلاش کرنے کی کوشش کی کہ جہاں دوزخیوں کا بیان ہوا ہے وہاں صرف ﴿......خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا﴾ کے الفاظ ہیں‘ مگر جہاں جنتیوں کا ذکر ہے وہاں ﴿......خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا﴾ (البیّنۃ:۸) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یعنی خَالِدِیۡنَ کے ساتھ اَبَدًا کا اضافہ ہے‘ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جنت کی زندگی ابدالآباد تک ہے جبکہ دوزخیوں کی سزا مکمل ہو جانے کے بعد آخر کار جہنم کو ختم کر دیا جائے گا۔ مگر قرآن مجید نے اس سخنوری کے سلسلہ میں بھی حجت تمام کر دی۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب میں فرمانِ احکم الحاکمین ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الۡكٰفِرِیۡنَ وَ اَعَدَّ لَهُمۡ سَعِیۡرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ﴿۶۵﴾﴾ ”بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے جہنم کی آگ تیار کر رکھی ہے۔ اس میں ابدالآباد رہیں گے“۔ تو ثابت ہوا کہ ”مَاشَآءَ رَبُّكَ“ عذاب ختم کرنے کے لیے نہیں بلکہ جتنا ”مزید“ عذاب دینا چاہے گا یا عذاب ”پکا“ کرنے کے لیے ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ میں جو چاہوں کروں! پس ان کافروں اور مشرکوں کو چھوڑوں بھی کیوں؟ ان کا جرم اتنا بڑا ہے کہ اللہ کے پیدا کردہ ہونے کے باوجود اللہ کی زمین پر رہ کر‘ اس کا دیا ہوا رزق کھا کر‘ اسی کے خلاف بغاوت کرتے رہے اور اس کی ذات یا صفات میں اوروں کو شریک بناتے رہے! ان کو شرم نہ آئی؟ لہٰذا عذاب ختم نہ کرنا عین حکمت کا تقاضا ہوا۔ اس بات کو امام الہند شاہ ولی اللہؒ کے بیٹے شاہ عبدالقادرؒ نے پوری طرح واضح کیا ہے‘ جنہوں نے ان آیات کا ترجمہ اپنی تفسیر ”موضح القرآن“ میں یوں کیا ہے:

”......رہیں گے آگ میں جب تک رہے گا آسمان وزمین اُس جہان (آخرت) کا۔
یعنی ہمیشہ‘ مگر جو چاہے رب تیرا (موقوف کردے لیکن وہ ”چاہ چکا“ کہ ختم نہ ہو) بالفاظِ

دیگر اپنے علم قدیم‘ علم محیط اور علم کامل کی بنیاد پر اُم الکتاب یعنی لوحِ محفوظ میں مشرک و کافر جہنمیوں کا عذاب دائمی ہونا لکھوا چکا۔ قلمیں رک گئیں اور کاغذ خشک ہو گئے۔‘‘

اس آیت کے ذیل میں داعی قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی تفسیر ’’بیان القرآن‘‘ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

’’اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ (سوائے اس کے جو تیرا رب چاہے) یعنی اگر اللہ تعالیٰ خود ہی کسی کے عذاب میں تخفیف کرنا چاہے یا کسی کو ایک مدت تک عذاب دے کر جہنم سے نکالنے کا فیصلہ فرمائے تو اسے اس کا پورا اختیار ہے۔ جزا و سزا کے بارے میں بھی اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اختیار مطلق ہے‘ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کا طے شدہ فیصلہ ہے کہ کفار کے لیے جہنم ابدی ٹھکانہ ہے۔‘‘

بدعت اور بدعتِ حسنہ

قرآن کے ایک اور مقام اور مضمون کو امام ابواسحٰق ابراہیم بن محمد الشاطبی الاندلسیؒ (متوفی ۱۳۸۸ ہجری) نے پوری طرح سمجھا اور بخوبی بیان کیا‘ وگرنہ بعض مترجمین نے جو ترجمہ کیا ہے اس سے تو ’’بدعتِ حسنہ‘‘ جیسی اصطلاح کی تصویب ہونے لگی تھی اور اہلِ بدعت کے ہاتھ ایک زبردست دلیل آ گئی تھی۔ چنانچہ:

﴿وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۥ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾ (الحدید:۲۷)

’’اور بھیجا ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو اور اسے انجیل عطا کی اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ہم نے ان کے دلوں میں بڑی نرمی اور رحمت پیدا کر دی۔ اور گوشہ نشینی کی راہ تو انہوں نے خود نئی نکالی‘ ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا‘ مگر (انہوں نے اپنے خیال میں) اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (خود ایسا کر لیا تھا) پھر جیسا اس کو نباہنا چاہیے تھا‘ نہ نبھا سکے۔‘‘

سے مطلب یہ اخذ کیا گیا کہ ’’اِلَّا‘‘ سے پہلے کے عمل یعنی ترکِ لذات‘ غیر شادی شدہ رہنا اور جنگلوں کی راہ لینا یا عبادت گاہوں میں گوشہ نشین ہو جانا‘ تو اللہ نے ناپسند فرمایا۔ البتہ ’’اِلَّا‘‘ کے بعد پسندیدگی کا اظہار کیا کہ اگر از خود مجرد زندگی کو اختیار کیا تھا تو اس کے تقاضوں کو پوری طرح نباہتے۔ مگر انہوں نے معبدوں میں جنسی بے راہ روی اور دین فروشی شروع کر دی

اور ’’رہبانیت‘‘ کے تقاضے پورے نہ کر سکے۔ لیکن امام شاطبی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے واضح فرمایا کہ ’’اِلَّا‘‘ کے لفظ نے ماقبل یعنی ’’بدعت‘‘ کے عمل کی مکمل نفی کر دی اور مابعد یعنی اللہ کی رضا کا اثبات یوں فرمایا کہ اللہ تو راضی صرف اس بات سے تھا کہ اس کی ’’خوشنودی‘‘ اس کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی اور اللہ کی نازل کردہ کتاب انجیل کی تعلیمات پر عمل کر کے حاصل کرتے‘ مگر وہ اس کا پاس نہ کر سکے۔ پس اجر و ثواب اور اپنی رضا کا پروانہ صرف انہیں دیا جن کے بارے میں فرمایا: ﴿فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ﴾ ’’جو لوگ (کتاب و سنت پر) ایمان لا کر ثابت قدم رہے‘ انہیں ہم نے ان کا اجر عطا فرمایا‘‘ البتہ وہ تھوڑے سے رہ گئے‘ بقولہٖ تعالیٰ: ﴿وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝﴾ (الحدید) ’’ان میں سے زیادہ تر (بدعتی ہو کر) نافرمان ہو گئے‘‘ —— تو ’’رِعَايَتِهَا‘‘ کی نسبت ’’رَهْبَانِيَّةَ‘‘ کی طرف نہیں بلکہ ’’ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ‘‘ کی طرف ہے کہ اللہ کے حکم خوشنودی کی رعایت نہ کر سکے۔ اس طرح امام شاطبی الاندلسیؒ نے یہ بات ثابت کر دی کہ الصادق والمصدوق پیغمبر اسلام ﷺ کی زبانِ حق بیان سے نکلی ہوئی بات ہی ’’پکی‘‘ ہے۔ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ((كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) یعنی ہر بدعت ہوتی ہی گمراہی ہے‘ کیونکہ اس کا نتیجہ گمراہی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ اور اس کی مثال انہی آیات میں موجود ہے کہ ’’رہبانیت‘‘ جسے لوگ ’’بدعة حسنه‘‘ کہتے اور دلیل بناتے ہیں‘ اس کا نتیجہ ’’گمراہی‘‘ کی صورت ہی نکلا۔ چنانچہ ان ’’رہبان‘‘ نے دعویٰ تو تاحیات کنوارے پن کا کیا‘ لیکن اس پر قائم نہ رہ سکے اور نکاح کی پاکیزہ لڑی میں پروئے جانے کی بجائے زنا کی عمیق کھائی اور قعر مذلت میں جا گرے۔ یوں قولِ پیغمبر اسلام ﷺ ((كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ)) سچ ثابت ہوا۔

آخر میں اللہ ذوالجلال والاکرام سے دعا ہے کہ وہ ہمیں قرآن حکیم کو صحیح طور پر سمجھنے سمجھانے‘ اس پر عمل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے‘ آمین!

❁❁❁

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

قرآن کریم اور ثقافتِ اسلامی

ڈاکٹر امداد حسین☆

قرآن کریم سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ پر قرآن کریم کا نزول اس لیے ہوا کہ وہ لوگوں کو کفر و گمراہی اور ضلالت و جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان و عمل کی روشنی میں لے آئیں۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ حکمِ الٰہی سے لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے‘ اور یہ دعوت قبول کر کے راہِ حق پر گامزن ہونے کے اچھے نتائج کی بشارت دیتے‘ اور انکار کے برے نتائج سے ڈراتے۔ بعض افراد پر یہ دعوت سامنے آتے ہی حق منکشف ہو گیا‘ اور ابتدائے نظر میں اس کے محاسن ان پر واضح ہو گئے‘ پھر انہوں نے بلا پس و پیش توحید و رسالت کی شہادت دے دی اور بتوں کی پرستش ترک کر دی جو نہ کسی کو کوئی نفع پہنچا سکتے تھے نہ ہی نقصان‘ اور دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے خدائے واحد کی عبادت کرنے لگے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہراتے:

﴿الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۱﴾ (ابراھیم)

’’(اے محمد ﷺ) یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا‘ تاکہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں ان کے رب کی اجازت سے‘ خدائے عزیز و حمید کے راستہ پر۔‘‘

لیکن کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے ابتدائے اسلام میں اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس دینِ حق کا انکار کیا جو نبی ﷺ لے کر آئے تھے اور قرآن کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق نہیں کی۔ اس کی وجہ محض ان کی نظر کا قصور اور ان کا عدمِ تدبّر تھا‘ چنانچہ ایسے ہی لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشادِ الٰہی ہوا:

☆ کلکتہ‘ بنگال‘ ہندوستان imdad6522@gmail.com

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۳﴾ (البقرۃ)

’’اگر تمہیں اس کے کلام اللہ ہونے میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر نازل کیا تو (اس کا فیصلہ بہت آسان ہے‘ اگر یہ محض ایک انسانی دماغ کا افتراء ہے تو تم بھی انسان ہو‘ زیادہ نہیں) اس جیسی صرف ایک ہی سورۃ بنا لاؤ‘ اور اللہ کے سوا جن (طاقتوں) کو تم اپنا حمایتی سمجھتے ہو‘ ان سب کو بھی اپنی مدد کے لیے بلا لو اگر تم سچے ہو۔‘‘

یہ چیلنج سامنے آنے کے بعد اب انہیں سوچنا پڑا اور انہوں نے غور و فکر اور تدبر و تحمل سے کام لیا‘ کیوں کہ وہ اہلِ فصاحت و بیان اور قادر الکلام تھے‘ خطابت کی باگ ڈور پوری طرح ان کے قبضہ میں تھی‘ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو قرآن کی ایک چھوٹی سی سورۃ بنانے سے عاجز و درماندہ پایا‘ باوجودیکہ وہ ایک دوسرے کے حامی و ناصر بھی تھے۔ بالآخر وہ اس حقیقت تک پہنچے کہ یہ کلام‘ بشر کے کلام کے مانند نہیں ہے اور نہ ہی کسی انسان کو اس جیسا کلام پیش کرنے کی قدرت حاصل ہے‘ اور یہ حقیقت میں اللہ ہی کی جانب سے نازل شدہ ہے۔ اس یقین کے بعد انہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ لیکن عرب کی اجتماعی زندگی میں قریش کو سیادت و قیادت اور تقدّس کا مرتبہ حاصل تھا‘ جس کی بنا پر بعض افراد اب بھی اپنے عناد پر قائم رہے اور اس دینِ حق کو مٹا دینے کی خاطر جان دینے اور جان لینے پر تلے رہے‘ اور سرکش وعناد اور ہٹ دھرمی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہجرت کے بعد بھی انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو ملیامیٹ کر دینے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

چنانچہ قریش کے اس فتنہ کے ایصال کے لیے ۸ ہجری میں فیصلہ کن اقدام کیا گیا‘ اس کے بعد مسلح مزاحمت ختم ہو گئی‘ اور عرب کے بیشتر قبائل بغیر کسی جبر و اکراہ کے دینِ حق میں جماعت در جماعت داخل ہونے لگے‘ اور اسلام اس طرح پھیلا کہ نبی مکرم ﷺ کے حیاتِ مبارکہ ہی میں پورا جزیرۃ العرب اسلام کے نور سے جگمگا اٹھا۔

اس اثناء میں قرآن کریم بھی ضرورت کے مطابق نازل ہوتا رہا‘ جس میں اوامر و نواہی بھی ہوتے‘ اور لوگوں کو اچھے اخلاق سے آراستہ ہونے اور بری عادتوں کے ترک کرنے پر آمادہ کیا جاتا۔ اور وہ ان احکام و ہدایات کی دل و جان سے تعمیل کرنے اور برائیوں سے بچنے کی کوشش کرتے رہے‘ حتیٰ کہ وہ اخلاق و عادات کے بلند مقام پر فائز ہوئے‘ اور ان کے

متفرق کلمے ونعرے مٹ گئے اور سب ایک کلمہ ہی پر جمع ہو گئے۔ پھر ان کے قلوب جو باہمی عداوتوں اور نفرتوں کے شکار تھے‘ وہ ایک دوسرے سے جڑ گئے اور اخوت و بھائی چارگی کے ساتھ راہِ حق پر جم گئے‘ جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب اور نبی آخر الزّماں حضرت محمدﷺ پر وہ آیت نازل کی جو ان کی عظمت وفضیلت اور ان کے حسنِ اَخلاق وعمل کی خبر دیتی ہے۔
چنانچہ ان کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

’’تم وہ بہترین اُمت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے میدان میں لائے گئے ہو‘ کہ تم اچھی باتوں کا حکم کرتے ہو‘ اور بری باتوں سے روکتے ہو‘ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘

اور اسی اثناء میں وہ آیتیں بھی نازل ہوئیں جو علم سے آراستہ ہونے‘ دین میں تفقّہ حاصل کرنے اور اس جہل سے نکلنے کی ترغیب دلا رہی تھیں جس میں وہ مبتلا تھے‘ مثلاً ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۭ﴾ (الزمر: ۹)

’’(اے محمدﷺ!) کہہ دیجیے وہ لوگ جو صاحبِ علم ہیں اور وہ لوگ جو علم سے بے بہرہ ہیں‘ کیا دونوں برابر ہیں؟‘‘

اور دوسری جگہ یہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ﴾ (المجادلۃ: ۱۱)

’’جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے‘ اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند کرے گا۔‘‘

اس طرح دیگر نزولِ آیات کے بعد ایک جماعت نے نبی اکرمﷺ کی خدمت میں ہمہ وقت حاضر رہنا اپنے اوپر لازم کر لیا‘ اور آپ کی مجالس میں‘ آپ کی مسجد میں اور آپ کے سفر و حضر میں‘ غرض وہ ہر وقت آپﷺ کی خدمت میں رہا کرتے تھے اور وحی نازل ہوتے ہی وہ اس کی طرف جھپٹتے اور ان آیات کو لکھ لیتے یا یاد کر لیتے‘ ان کے معانی میں غور وفکر کرتے اور ان کے مقاصد پر پہنچنے کے لیے فکر و نظر سے کام لیتے۔ یوں اس جماعت نے اللہ کے کلام اور اس کے رسولﷺ کی سُنّت میں فہم و بصیرت حاصل کر لی اور کتاب و سُنّت کی حکمتوں سے پوری طرح آشنا ہو گئی۔ حکمت کے چشمے ان کے قلوب سے جاری ہوئے اور وہ رسول اللہﷺ کے

اس ارشاد کے مصداق بن گئے:

((مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ)) (متفق علیہ)

’’اللہ تعالیٰ جس سے خیر کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کا فہم عطا فرما دیتا ہے۔‘‘

چنانچہ یہ بندگانِ خدا جزیرۃ العرب سے اٹھے جبکہ کلمہ توحید‘ بندگانِ خدا کی محبت و ہمدردی اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا ان کے لیے زبردست اسلحہ تھا۔ اور ان کے سامنے یہ کتابِ مبین تھی جس کے حلال کیے ہوئے کو حلال سمجھتے اور جس کے حرام کیے ہوئے کو حرام جانتے اور اس کتاب کے تعلیم کردہ آداب سے وہ مکمل طور پر آراستہ تھے۔ مشرق ومغرب اور شمال میں اپنے پڑوسی ملکوں فارس‘ روم‘ قبط وترک وغیرہ کے دروازے کو کھٹکھٹایا اور ان کو دینِ حق کی طرف دعوت دی‘ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند فرمایا۔ پھر اگر انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کیا گیا اور اس پر بھی راضی نہ ہوئے تو ان سے قتال کیا‘ یہاں تک کہ یہ ممالک ان کے زیر نگیں آ گئے۔ اور انہوں نے ان ملکوں میں ایسے لوگوں کو مقرر کیا جو انہیں کتاب اللہ کی تعلیم دیں اور اس کی ہدایت پر چلائیں اور کتاب اللہ کی تعلیمات کے مطابق ان کے فیصلے کریں۔ تو ان ممالک کے جن لوگوں نے پہلے اپنی آنکھوں پر پردہ رہنے کے سبب اس نور کو نہیں دیکھا تھا‘ انہوں نے اب اس کا ادراک کر لیا اور انہیں اس امر کا یقین ہو گیا کہ اسلام ہی دینِ فطرت ہے۔ انسانی کمالات کا ضامن اور آدابِ الٰہیہ کا جامع یہی دین ہے جو دنیا کی فلاح اور آخرت کی سعادت حاصل کرنے والے عمل کی دعوت دیتا ہے۔

اسلام کی بلند و برتر عمارت نصف صدی سے کم میں کھڑی ہو گئی‘ جس میں اللہ تعالیٰ نے اس خیر امت کے دین کو جو لوگوں کی اصلاح کے لیے بھیجا تھا‘ مکمل کر دیا اور نبی اکرمﷺ پر حج اکبر (حجۃ الوداع) کے دن یہ آیت نازل فرمائی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ (المائدۃ: ۳)

’’آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا۔‘‘

یہ وہ اصحابِ رسولﷺ تھے جو اذہان کی جولانی اور قلوب کی گہرائیوں کے ساتھ نبی

آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی سنت سے ہدایت پا رہے تھے‘ چنانچہ ان میں علماء وحکماء بھی پیدا ہوئے‘ جرنیل وسپہ سالار بھی‘ اور ان کی صفوں سے سیاست دان ومدبّر بھی پیدا ہوئے‘ اور وقت کے ان ائمہ وقائدین نے ان ایک لاکھ سے زائد نفوسِ قدسیہ کی زندگی کی نگرانی کی‘ جو آفتاب و ماہتاب‘ نجومِ ہدایت اور فضیلت مآب گلاب تھے‘ جن سے اسلامی تہذیب پروان چڑھی۔

ثقافتِ اسلامی کا پہلا مرحلہ نورِ اسلام کے مشرق (دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے شروع ہوتا ہے اور دولتِ عبّاسیہ کے قیام پر ختم ہوتا ہے۔ اس مرحلہ میں اسلام کی عظمت روشن ہوئی اور اس ثقافت کی ابتدا ہوئی جو ”الذِّکرِ الحَکِیم“ (قرآن) کے فانوس سے نور حاصل کرتی تھی۔ یہ مرحلہ ایسی چیز میں ممتاز ہے جسے تہذیب وثقافت کے علم میں درک وبصیرت رکھنے والوں نے ایک عظیم الشان تاریخی کارنامہ قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیس سال سے کم عرصہ میں رسول اللہ ﷺ نے اسلامی ممالک کی ایک مستحکم بنیاد اس عربی امت کے لیے رکھ دی جو صدیوں سے مختلف گروہوں میں منقسم تھے اور اس کے متفرق قبائل کو قرآن کے پرچم تلے منظم ومجتمع کر دیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک اُمت تہذیب کا علم لے کر اٹھی اور دنیا میں اس امانت کو پہنچانے کے لیے نکل کھڑی ہوئی اور ساری دنیا کو رسولِ اعظم خاتم النّبیّین حضرت محمد ﷺ کی رسالت پہنچا دی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں اتنے قلیل عرصہ میں ان ممالک واقالیم کو فتح کرا دیا اور وقت کے قیصر وکسریٰ کی تلواریں ٹوٹ گئیں‘ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

کانٹ ہنری وی کاسٹری اپنی کتاب ”اسلام“ میں ”سوانح وخواطر“ کے عنوان سے لکھتا ہے:

> ”محمد (ﷺ) کے پیرو ہی صرف ایسے ہیں جنہوں نے اپنے مفتوحین کے معاملے میں نرمی برت کر اور رغبت دلا کر اپنے دین کے پھیلانے کے کام کو جمع کیا اور یہی رفق وترغیب عرب کی فتوحاتِ عظیمہ کے باب میں ان کا دفاعی حربہ تھا‘ اور ان کامیاب لشکروں پر قرآن کا پرچم سایہ فگن تھا‘ اس لیے وہ جس جس راہ سے گزرے اس پر جور و تشدد کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا۔“

اور فرانس کا فلسفی ”غوستاف لوبون“ GOUTHIOR کہتا ہے کہ بیت المقدس والوں کے ساتھ حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) نے جو معاملہ کیا تھا اس کا علم جسے ہوگا اس کو اس بات کا یقینی علم ہو جائے گا کہ وہ لوگ اپنے مفتوحین کے ساتھ انتہائی حد تک حسن سلوک کیا کرتے تھے‘ جبکہ اس کے برعکس وہ معاملہ ہے جو صلیبی جنگوں کے زمانہ میں بیت المقدس میں عیسائیوں نے مسلمانوں

کے ساتھ روا رکھا تھا۔

اسی حیرت انگیز زمانہ میں ثقافت کی جلوہ فرمائیاں ہوتی ہیں کہ زندہ اقوام کے نزدیک یہ بھی تہذیب کی قسموں میں سے ایک قسم ہے‘ چنانچہ اسلامی فوجوں نے‘ جو بجائے خود ایک طرح کے حربی مدارس تھے‘ بڑے بڑے جرنیل‘ عظیم فاتح‘ جنگی ہیرو اور قائدین پیدا کیے۔ مثال کے طور پر فخر الاسلام سیف اللہ ابوسلیمان‘ خالد بن ولید‘ فاتح قادسیہ سعد بن ابی وقاص‘ امین الامت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور رسولِ خدا ﷺ کے محبوب اسامہ بن زید اور فاتح مصر عمرو بن العاص وغیرہ کہ یہ سب جلیل القدر صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) ہیں۔ اس جنگی حرکت کے ساتھ علمی وادبی حرکت بھی ہونے لگی‘ کیونکہ ادب ہی کے ذریعہ سے کسی قوم کے تمدن وارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں سے فصیح وبلیغ خطباء‘ اچھے کلام پیش کرنے والے شعراء اور بہترین انشا پرداز پیدا ہوئے۔ اور یہ زمانہ عربی لغت کے لیے میدانِ فضل‘ اس کے اسرار کا مظہر اور اس کی جدّت کا آئینہ دار تھا۔ اور یہ ارتقائی حرکت قرآن عظیم کا طفیل تھی‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو کثرت سے فضائل عطا کرنے کے باوجود لسانی فصاحت اور قوتِ خطابت سے زیادہ بڑی کوئی فضیلت نہیں بخشی تھی۔

پھر اس مرحلہ کی صبح نے اجتماعی ثقافت کی ایک ایسی نوع کا مشاہدہ کرایا کہ کسی امت کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس سے ہماری مراد اسلام کا وہ نظامِ عدل وقسط ہے‘ جس کے پیچھے اس روحِ مساوات اور اس انسانی وحدت کی کارفرمائیاں ہیں جسے قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ﴾ (الحجرات:۱۳)

> ”اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا‘ اور مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔“

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

> ”لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو مٹی سے بنایا گیا ہے‘ اور کسی عربی کو کسی عجمی پر

کوئی فضیلت نہیں ہے‘ بجز تقویٰ کے۔‘‘ (مسند احمد)

ایک روایت کے مطابق یہی بات زبانِ رسالت ﷺ سے ان الفاظ میں ادا ہوئی:

’’کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں‘ اور نہ کسی عجمی کو عربی پر‘ نہ کسی گورے کو کالے پر‘ اور نہ کسی کالے کو گورے پر‘ سوائے تقویٰ کے۔‘‘ (حوالہ مذکور)

اور سنن ترمذی کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے یہ بات بایں الفاظ فرمائی:

((كُلُّكُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ))

’’تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے تھے۔‘‘

اس سلسلہ میں سب سے قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ اسلامی ثقافت ٹھیک ایسی ہی تھی (جس کا درس قرآن کی مذکورہ آیت اور حدیث کے مذکورہ فقرے نے دیا ہے۔) اور گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ اس تہذیب کو پیدا کیا تھا اسلام نے‘ اور فکری و تربیتی زمین کی حیثیت عربی کو حاصل تھی۔ اس وقت مسلمانوں کے پاس قرآن کریم اور نبی ﷺ کی حکیمانہ تعلیمات کے سوا کوئی چشمہ ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنی ثقافت کو سیراب کرتے۔ نیز اُس وقت فکری رہنما عرب کے سوا اور کوئی نہ تھے‘ یا پھر وہ مستعربین تھے جو اسلامی تعلیمات کی آغوش میں پلے اور اسلام ہی کی آب و ہوا میں بڑھے تھے اور کسی غیر سے انہوں نے عربیت نہیں سیکھی تھی۔ دراصل اسلامی ثقافت کی تعبیر کا سچا ترجمان وہی زمانہ تھا۔ یہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اسلام ایک مستقل ثقافت ہے جو اپنے ہر انداز اور ہر زاویہ سے بالکل جدید قسم کی ہے جو قرآن کریم کی وحی اور سنتِ مطہرہ کے انوار سے جگمگاتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی ثقافت کے باب میں مسلمان دنیا کی کسی بھی قوم کے رہینِ منت نہیں اور اس تہذیب نے کسی بھی دوسری تہذیب سے کسی بات میں استفادہ نہیں کیا‘ کیونکہ اُس وقت تک مسلمانوں کے ہاں کسی گزشتہ قوم کے علوم کے نقل و ترجمہ کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ ❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘ آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

تقسیمِ وراثت کی اہمیّت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو اس کا چھوڑا ہوا مال اسی لمحے وارثوں کی ملکیت میں آ جاتا ہے۔ البتہ اس مال میں سے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس کے ذمے قرض ہو تو وہ بھی ادا کیا جائے گا۔ مرنے والے کو چھوڑے ہوئے مال کے تیسرے حصے تک کی وصیت کرنے کی اجازت ہے‘ وہ بھی ادا کر دی جائے گی اور بقیہ مال جائز وارثوں میں قرآن و حدیث کی روشنی میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ چونکہ وراثت کی تقسیم اللہ ربّ العزّت کا حکم ہے اس لیے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں سورۃ النّساء کے ابتدائی حصے میں تقسیمِ میراث کے تفصیلی احکام دیے گئے ہیں۔ ان احکام میں ﴿یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ﴾ یعنی ’’اللہ تمہیں وصیت کرتا ہے‘‘ کے الفاظ ہیں۔ گویا تقسیمِ میراث قرآنی ہدایات کے مطابق لازم ہے۔

فوت ہونے والے کا چھوڑا ہوا مال اسی وقت شرعی وارثوں کی ملکیت میں چلا جاتا ہے‘ اس لیے اس مال میں سے تمام ورثاء کی مرضی کے بغیر خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ورثاء اس کے چھوڑے ہوئے مال کا کچھ حصہ یا تمام کا تمام کسی نیک کام میں لگا دیں تو اس کا ثواب مرنے والے کو نہیں پہنچے گا‘ کیونکہ وفات کے بعد یہ مال اُس کا نہیں رہا تھا۔ اب اس نیک کام کا ثواب وارثوں کو ملے گا۔

وراثت کے مال میں سے کفن دفن کے اخراجات کے علاوہ میّت کے ذمہ قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے۔ کیونکہ شہید بھی اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا جب تک اس کا قرض نہ ادا کر دیا جائے۔ اگر مرنے والے مرد نے اپنی بیوی کو حق مہر نہ ادا کیا ہو تو وراثت کا مال تقسیم کرنے سے پہلے بیوی کو مہر ادا کیا جائے گا کیونکہ یہ بھی قرض ہے۔ پھر مرنے والے کی وصیت پوری کی جائے‘ اگر وہ جائز ہو اور اس کی مقدار بھی کُل وراثت کے ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے

بعد بقیہ مال‘ تھوڑا ہو یا زیادہ‘ ورثاء میں شرعی ضابطے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ سورۃ النساء میں پہلے وراثت کے احکام بتائے گئے ہیں‘ پھر شرعی قوانین پر عمل نہ کرنے والوں کے لیے سخت عذاب کی وعید بایں الفاظ سنائی ہے:

﴿وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْھَا ۠ وَلَہٗ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ﴿۱۴﴾﴾

’’اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اُس کے رسول کی اور نکل جائے اس کی حدوں سے‘ اللہ ڈالے گا اس کو آگ میں‘ ہمیشہ رہے گا اس میں‘ اور اُس کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔‘‘

اس آیت کی تفسیر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ ’’تفہیم القرآن‘‘ میں رقم طراز ہیں:

’’یہ ایک بڑی خوفناک آیت ہے‘ جس میں ان لوگوں کو ہمیشگی کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانونِ وراثت کو تبدیل کریں...... لیکن سخت افسوس ہے کہ اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدوں کو توڑا۔ اس قانون وراثت کے معاملہ میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں‘ وہ خدا کے خلاف کھلی بغاوت کی حد تک پہنچتی ہیں......‘‘

اسی طرح سید مودودیؒ سورۃ الفجر کی آیت ﴿وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾﴾ ’’اور تم میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔‘‘ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

’’عرب میں عورتوں اور بچوں کو میراث سے ویسے ہی محروم رکھا جاتا تھا اور لوگوں کا نظریہ اس باب میں یہ تھا کہ میراث کا حق صرف مَردوں کو پہنچتا ہے...... حق اور فرض کی کوئی اہمیت ان کی نگاہ میں نہ تھی کہ ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دیں‘ خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو!‘‘

موت ایک حقیقت ہے جس کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ہر شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ چھوڑے ہوئے مال کے ایک تہائی میں کسی جائز اور ثواب کا کام کرنے کی وصیت کر جائے۔ ترکے کے تہائی حصہ سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں اور اگر کسی نے کر دی تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا‘ کیونکہ اس طرح شرعی وارثوں کو نقصان پہنچے گا۔ مرنے والا تو چلا گیا‘ اب پس ماندگان کا فرض ہے کہ وہ وراثت کی تقسیم میں اللہ سے ڈرتے ہوئے شرعی ضابطے کے

مطابق عمل کریں اور قرآن میں بتائی گئی خدائی ہدایات کی نافرمانی سے بچیں اور کفار کی پیروی ہرگز نہ کریں۔ برصغیر میں ہندو رہتے تھے۔ جب یہاں اسلام آیا تو کچھ لوگ ہندومت چھوڑ کر مسلمان ہونے لگے۔ ہم ان ہی کی اولاد ہیں۔ یہاں کے جن لوگوں نے اسلام قبول کرلیا وہ ہندووانہ رسموں کو نہ چھوڑ سکے۔ ہندوؤں میں بیٹیوں کو وراثت سے یکسر محروم رکھا جاتا تھا اور شادی کے موقع پر انہیں جہیز کی صورت میں کچھ سامان دے دیا جاتا تھا۔ مسلمان ہندوؤں کے اس طریقے کو نہ چھوڑ سکے اور بیٹیوں کو وراثت سے محروم رکھنے اور جہیز دینے کی پابندی کرنے لگے۔ عربوں کے جاہلی معاشرے میں بھی لڑکیوں کو مرنے والے کی وراثت سے قطعاً محروم رکھا جاتا تھا اور وراثت کا حق صرف لڑکوں کو دیتے تھے‘ وہ بھی ان کے اپنے طریقوں کے مطابق۔ مثلاً وراثت صرف اس لڑکے کو ملتی جو گھوڑے پر سواری کر سکتا ہو‘ جنگ میں جانے کے قابل ہو۔ اس کے علاوہ اور بھی بے ہودہ طریقے ان میں رائج تھے۔

برصغیر کے مسلمان آج بھی ہندوؤں کے طور طریقوں سے نہیں نکل سکے اور وراثت کے اسلامی اصولوں کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔ بیٹی کو شادی کے وقت جہیز ضرور دیتے ہیں خواہ اس کے لیے قرض ہی لینا پڑے۔ بیٹیوں کو شادی کے موقع پر جہیز کی صورت میں گھریلو ضروریات کا سامان دینا ہندوؤں کی رسم ہے‘ کیونکہ ان کے ہاں بیٹیوں کو وراثت نہیں دی جاتی۔ اسی طرح جس گھر میں موت ہوجائے وہاں ہندوؤں کی نقالی میں طرح طرح کی ناروا ناجائز اور بے ہودہ رسموں کی پیروی کی جاتی ہے۔ ورثاء وراثت کا مال تقسیم کرنے سے قبل غیر شرعی رسومات پر خرچ کرتے ہیں۔ ان رسومات میں اکثر فضول خرچی ہوتی ہے اور شرعی احکام کی خلاف ورزی بھی۔

برصغیر کے بہت سے مسلمان بیٹیوں کو وراثت سے حصہ نہیں دیتے۔ اکثر تو جہالت کی بنا پر اور کچھ مالدار اس خیال سے کہ اگر بیٹی کو حصہ دیا تو وہ بیٹی کے سسرال میں چلا جائے گا اور ہماری ملکیت سے نکل جائے گا۔ ایسا خاص طور پر بڑے زمینداروں اور مال داروں میں عام ہے۔ وہ اپنی زرعی زمین یا دولت کا ایک حصہ دوسرے خاندان کو دینا پسند نہیں کرتے۔ مال و دولت سب کو پسند ہوتا ہے۔ زمینداروں کو اپنی زمین بڑی عزیز ہوتی ہے۔ وہ اپنی زمین کی وراثت بیٹی کے سسرال میں منتقل نہیں کرنا چاہتے۔ کچھ لوگ لڑکیوں کے ذہن میں شروع ہی سے یہ خیال ڈال دیتے ہیں کہ بھائیوں سے حصہ نہیں لینا‘ اگر لیا تو یہ بھائیوں کے ساتھ تمہاری

عداوت ہوگی۔ بعض بھائی اپنی بہنوں سے کہتے ہیں کہ اپنا حصہ معاف کر دیں۔ بہن بے چاری مروت کی ماری ہاں کر دیتی ہے‘ جبکہ جبر کی اس ہاں کی کوئی حیثیت نہیں۔ بہن کو اس کا حصہ ضرور دیا جائے۔ اس کے بعد وہ اپنی آزاد مرضی سے بھائیوں کو دے دے تو ٹھیک ہے‘ مگر ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ وراثت میں بیٹی کا حصہ منصوص ہے‘ لہٰذا اگر بیٹی کو حصہ نہ دیا جائے اور وہ خود مانگ لے تو بھی اس میں کوئی برائی نہیں‘ بلکہ یہ اللہ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ اگر وارث بیٹیاں زیادہ ہوں تو ایسا بھی ہوگا کہ وراثت کا بڑا حصہ بیٹیاں لے جائیں گی اور بیٹوں کو یہ برداشت کرنا ہوگا‘ مثلاً مورث کا ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہوں اور وراثت تین لاکھ روپے یا تین مربع زرعی زمین ہو تو لڑکے کو ایک لاکھ روپیہ یا ایک مربعہ اراضی ملے گی اور دو لاکھ روپے یا دو مربعے اراضی لڑکیوں کے حصے میں آئے گی۔ مگر لالچ میں آ کر ایسا نہیں کیا جاتا۔ اس طرح حق داروں کو ان کے حق سے محروم کیا جاتا ہے تو یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلمان کسی کافر کا وارث نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح کوئی کافر مسلمان کی وراثت سے حصہ نہیں پاسکتا خواہ ان میں کتنی قریبی رشتہ داری ہو۔ اسی طرح اگر مورث کو کوئی وارث قتل کر دے تو وہ وراثت سے محروم رہے گا۔ بعض اوقات وارث لالچ میں اندھا ہو کر اپنے باپ کو قتل کر دیتا ہے۔ ایسا شخص باپ کے قتل کا گناہ بھی اٹھائے گا اور وراثت سے بھی محروم رہے گا۔

وراثت کی تقسیم میں اپنی مرضی کرنے کی ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ لڑکی کی شادی ہی نہیں کی جاتی‘ بلکہ اسے غیر شادی شدہ رہنا باعث فضیلت بتاتے ہیں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے جو لڑکی کے ساتھ اس کے بھائی روا رکھتے ہیں تاکہ ماں باپ کی جائیداد کا کچھ حصہ ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ایسا کرنے والے اس معاملے میں عذاب کی دھمکی سے بھی خوفزدہ نہیں ہوتے۔

وراثت کے بارے میں یہ حکم ہے کہ وراثت کا مال تھوڑا ہو یا زیادہ اس کو شرعی قانون کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ اس کا ذکر سورۃ النساء میں بھی ہے اور احادیث میں بھی۔ مسلمان اکثر وراثت کے معاملے میں گناہِ عظیم کے مرتکب اور عذابِ مہین کے مستحق بن رہے ہیں۔ بعض محتاط لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد اپنے بچوں میں تقسیم کر دیں۔ ایسی صورت میں یہ وراثت نہ ہوگی بلکہ یہ ہبہ ہے‘ اس لیے بیٹے کو بیٹی سے دوگنا حصہ نہیں ملے گا بلکہ بیٹی کو بھی

اتنا ہی ملے گا جتنا بیٹے کو۔

میراث کی اہمیت اس قدر ہے کہ کسی جائز وارث کو‘ بجز مُورِث کے قاتل کے‘ کسی عذر پر بھی میراث سے محروم نہیں کیا جا سکتا‘ حتیٰ کہ کسی مرنے والے کا کوئی شرعی وارث مُورِث کا نافرمان‘ بدقماش یا جرائم میں ملوث ہو تو پھر بھی وہ وراثت پائے گا۔ بعض والدا پنے نافرمان اور بدکردار بیٹے یا بیٹی کو جائیداد سے محروم کرنے کا اشتہار شائع کر دیتے ہیں۔ اس اشتہار کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ شرعی وارث بہر حال وراثت پائے گا۔ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی مگر عورت ابھی عدّت میں ہے کہ اس کا شوہر فوت ہو گیا تو بھی یہ عورت اپنے شوہر کی وراثت میں حصہ پائے گی۔

الغرض بہنوں کو ماں باپ کی وراثت نہ لینے پر آمادہ کرنا یا جہیز کو وراثت کا قائم مقام ٹھہرانا ویسا ہی جرم ہے جیسے بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو ہفتہ کے دن مچھلیاں پکڑنے سے روکا گیا تو انہوں نے ہفتے کے دن مچھلیوں کو پابند کر کے اتوار کے دن پکڑنے کا بہانہ تراش لیا اور کہتے کہ ہم نے ہفتے کے دن تو مچھلیاں نہیں پکڑیں۔ اس پر انہیں مسخ کا عذاب دیا گیا۔ بہنوں کو بھی بھائیوں کو بتانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے شرعی احکام نہ توڑیں‘ بلکہ ہر وارث کو اس کا مقررہ حصہ خوشی سے ادا کریں کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

الغرض وراثت کا مال جائز وارثوں کا حق ہے۔ انہیں وراثت سے محروم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کا مال دبا لینا۔ اور جو کوئی ایسا کرے گا اسے حق دار کو حق دینا پڑے گا‘ ورنہ حساب کے دن اسے یہ حق اپنی نیکیوں کی صورت میں ادا کرنا پڑے گا۔ اس دن پچھتانا کسی کام نہ آئے گا۔

[اس مضمون کے اندر میراث کے تمام مسائل کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شخص اپنی مخصوص صورت حال کسی مفتی کو بتا کر اس سے وارثوں کے حصے دریافت کرے اور اس پر عمل کرے۔]

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ظلم کی وسعت اور خواتین کے مظالم

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

قرآن حکیم کی رو سے سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے سب سے پہلی بات یہی فرمائی تھی کہ:

﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ (لقمان)

’’اے میرے پیارے بچے! دیکھنا کہیں اللہ کے ساتھ (اس کی ذات وصفات میں) کسی کو شریک نہ ٹھہرا لینا۔ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی ناانصافی ہے۔‘‘

قرآن کریم کی متعدد آیات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ ظلم اور ناانصافی نہیں کرتا اور نہ ہی ظلم اور ناانصافی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴾ (الانبیاء)

’’ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو رکھ دیں گے‘ پس کسی جان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ظلم ہوگا تو اس کو ہم لے آئیں گے۔ اور حساب لینے کے لیے ہم کافی ہیں۔‘‘

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِتَّقُوا الظُّلْمَ ، فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (صحیح مسلم)

’’ظلم سے بچتے رہو‘ اس لیے کہ ظلم قیامت کے روز اندھیروں کی صورت میں ظاہر ہوگا۔‘‘

پیارے نبی ﷺ کی ایک حدیثِ مبارکہ ہے کہ دس چیزیں دس چیزوں کو کھا جاتی ہیں۔ ان میں سے آخری بات یہ فرمائی: ’’عدل ظلم کو کھا جاتا ہے۔‘‘

اہلِ علم نے ’ظلم‘ کی تعریف اس طرح کی ہے: وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ ۔ یعنی کسی چیز کو اس کے مقام سے ہٹا دینا (اس کے مقام سے گرا دینا یا بڑھا دینا) ظلم ہے۔ کسی بھی چیز

سے مراد ایک بے جان چیز بھی ہوسکتی ہے‘ جبکہ شریعت کے کسی قانون یا فرض کو اخلاقی تعلیم قرار دینا اور اخلاقیات کو فرض کا درجہ دے دینا بھی ظلم ہے۔

اس کو ہم عام سطح پر اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ کاپی یا کتاب اوپر رکھنے کی چیز ہے اور ہم نے اس کو اُٹھا کر زمین پر رکھ دیا تو گویا یہ کتاب یا کاپی کے ساتھ ظلم ہے۔ یا کسی نے جھاڑو کو یا جوتے کو اٹھا کر میز یا چارپائی پر رکھ دیا تو یہ بھی ظلم ہے۔ اگرچہ چوٹی کا ظلم تو شرک ہے لیکن ظلم کی تعریف کے مطابق تو لگتا ہے کہ ظلم کے بہت سے درجے ہیں‘ جیسے جہاد کے بہت سے درجے ہیں —— اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک بھی اسی وجہ سے ظلم عظیم ہے کہ یا تو مخلوق میں سے کسی کو اللہ کے برابر یا اللہ سے اوپر کر دیا جائے‘ یا نعوذ باللہ‘ اللہ تعالیٰ کو اس کے مقام ارفع سے گرا کر نیچے کر دیا جائے۔ یہ ظلم یعنی شرک اللہ تعالیٰ کی ذات‘ صفات‘ حقوق یا بندگی ہر سطح پر ہوسکتا ہے۔ (اعاذنا اللّٰہُ مِنھا)

عام طور پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ظلم تو طاقتور ہی کرسکتا ہے‘ یا معاشرتی سطح پر ہم کہتے ہیں کہ ظلم پھیلا ہوا ہے‘ جبکہ پورے نظام کے ساتھ بھی ظلم ہوسکتا ہے‘ اور انفرادی و اجتماعی سطح پر بھی ظلم ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں جابجا ظلم اور ظالم کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ ’’میدانِ حشر میں (کسی پر) کوئی ظلم نہیں ہوگا‘‘ اور ’’اللہ ایک ذرے کے برابر ظلم نہیں فرماتا‘‘ اور ’’ہم ظالم نہیں ہیں بلکہ یہ خود ظالم ہیں‘‘ اور ’’انہوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں‘‘۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ جو ذات ذرّہ برابر ظلم نہیں کرتی وہ ایک رائی کے دانے کے برابر ظلم برداشت بھی نہیں کرے گی۔ غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب ایک بے جان چیز پر بھی ظلم ہوسکتا ہے تو ہر با اختیار شخص اپنے ماتحتوں پر ظلم کرسکتا ہے۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم ظالم نہیں ہیں‘ ہم نے ظلم نہیں کیا؟ سورۃ الاعراف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جب قوموں کو سزا دیتے ہیں تو لوگ دہائی دیتے ہیں کہ ’’اے اللہ‘ ہم ہی ظالم تھے!‘‘ سورۃ الانبیاء میں ایسا ہی نقشہ سامنے آتا ہے کہ انسان کہے گا: ’’ہائے ہماری بربادی...... ہم تو خود ہی ظالم تھے۔‘‘

ایک حدیثِ قدسی کے الفاظ ہیں:

((يَا عِبَادِيْ اِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ وَجَعَلْتُهٗ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا، فَلَا تَظَالَمُوْا)) (صحیح مسلم)

”اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام ٹھہرالیا ہے اور اسے تمہارے مابین بھی حرام قرار دیا ہے‘ پس تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو!“

ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ یہ کون سے مظالم ہم ساری عمر ایک دوسرے پر کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے منہ سے یہ الفاظ نہ چاہتے ہوئے بھی نکل جائیں کہ ہم تو ظالم تھے! ہم پڑھتے رہتے ہیں کہ درخت کاٹنا بھی ظلم ہے۔ جانور کے ساتھ سختی سے پیش آنا‘ اس کو بھوکا پیاسا رکھ کر سزا دینا بھی ظلم ہے۔ جانوروں کے بارے میں تو نبی اکرم ﷺ کی کئی احادیثِ مبارکہ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جانور ہمارے رحم کے مستحق ہیں نہ کہ ظلم و زیادتی کے۔ ہم بااختیار ہیں اور وہ بے اختیار۔ اور انسان اکثر وبیشتر اپنے اختیار کا استعمال بے جا اور ناحق ہی کرتا ہے۔

بے جان اشیاء اور جانوروں پر ظلم کے بعد ہم خود اپنی جان پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ سب سے بڑا ظلم جو انسان خود اپنی جان پر کرتا ہے وہ شرک ہے۔ سورۂ یوسف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۝١٠٦﴾ ”لوگوں کی اکثریت اللہ پر ایمان اس حال میں لاتی ہے کہ وہ شرک کر رہے ہوتے ہیں۔“ (لیکن ان کو پتہ ہی نہیں چلتا) اگر بظاہر ہم کسی بت کو سجدہ نہیں کر رہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم تو شرک نہیں کر رہے‘ جبکہ مندرجہ بالا ظلم کی تشریح میں تو ہم جابجا شرک میں ملوث ہو رہے ہوتے ہیں۔ دو جگہ قرآن میں ارشاد ہے کہ انسان خود اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنالیتا ہے۔ اس خوفناک ظلم سے بچنا کتنا مشکل کام ہے۔

اسی طرح انفرادی طور پر شیطان کا کہا ماننا ظلم ہے۔ سورۂ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ تمام معاملات چکانے کے بعد شیطان کو حاضر کیا جائے گا اور وہ اپنی براءت کرے گا اور انسان کو قصوروار ٹھہرائے گا کہ ”اللہ تعالیٰ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا جسے میں نے پورا نہیں کیا۔ میرا تم پر کوئی اختیار تو تھا نہیں‘ میں نے تو تمہیں صرف برائی کی طرف دعوت دی تھی‘ مائل کیا تھا‘ تو تم نے میری بات مان لی۔ تو اب تم لوگ مجھے ملامت نہ کرو‘ بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ اب نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکتے ہو۔ بلاشبہ میں انکار کرتا ہوں اس کا جو قبل ازیں تم مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہراتے رہے تھے۔ بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے“۔ سورۂ یٰسٓ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی بندگی نہ

کرنا‘ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے‘ اور صرف میری ہی بندگی کرنا‘ یہی سیدھا راستہ ہے“۔ یہ ہمارا خود اپنی ذات پر ظلم ہے جو ہم دن رات کرتے رہتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم دو طرح سے کرتے ہیں (جو حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی ہے) نمبر ایک حقوق اللہ میں شرک جس کے بارے میں ذکر ہو چکا۔ اور یہ ظلم ہم اپنی غلطیوں اور ظلم کا اعتراف کر کے اللہ سے معافی مانگ کر معاف کروا سکتے ہیں‘ جبکہ دوسرا ظلم ہم حقوق العباد کے ضمن میں کرتے ہیں‘ جو صرف اللہ سے معافی مانگ کر معاف نہیں ہو سکتا‘ بلکہ جن انسانوں پر ظلم کیا ہے ان سے بھی معافی مانگیں (ورنہ لوگ قیامت کے دن ہم سے ظلم کا بدلہ لے لیں گے)۔ اپنی پچھلی روش پر ہمیں ندامت ہو اور آئندہ کے لیے ظلم کی بجائے حسنِ سلوک اور عدل سے کام لیں۔

ہمارے پاس جتنا زیادہ اختیار ہوگا اسی قدر ہمارے اندر ظلم کرنے کا پیمانہ بھی بڑا ہو سکتا ہے اور اختیار کی بنیاد پر ہی ہم ہر کسی کے ساتھ عدل کر کے اس ظلم سے بچ سکتے ہیں۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے اس کی مثال دیتے ہوئے سمجھایا کہ ”تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا“۔ تو جس کے پاس جتنا اختیار ہوگا اس کی مسئولیت بھی اتنی زیادہ ہوگی۔

سیاسی سطح پر ایک بادشاہ کا اپنے آپ کو مختارِ کل سمجھ لینا بہت بڑا ظلم ہے۔ معاشی سطح پر جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مطابق من مانیاں کرنا ظلم ہے۔ ناپ تول میں کمی‘ سودی کاروبار‘ رشوتوں کا لین دین‘ ناخالص چیز بیچنا‘ ملاوٹ کرنا سب کچھ ظلم ہے جو انسان انسان پر کر رہا ہے۔ معاشرتی سطح پر چونکہ خواتین کا عمل دخل بہت زیادہ ہے‘ لہٰذا ان سے ظلم کا ارتکاب بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور ہم خواتین کے ظلم کا نشانہ بننے والے لوگ بھی ہماری طرح کے انسان ہیں بلکہ اکثر وبیشتر خواتین ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم یہاں عورت بحیثیت مالکہ‘ بحیثیتِ ماں‘ بحیثیت اولاد وغیرہ‘ خواتین کے ظلم کا ہی تذکرہ کریں گے۔

عورت کے مظالم بحیثیتِ مالکہ

ملازمین پر کیا جانے والا ظلم دو طرفہ ہے‘ ایک تو خود اپنی جانوں پر اور دوسرے اپنے ماتحتوں پر۔ اس ظلم کی کئی ایک صورتیں ہیں‘ مثلاً جس کام کا معاوضہ طے کر کے ہم نے ان کو رکھا

ہوا ہے‘ اس سے زیادہ کام کروانا اور مزید کام کے پیسے نہ دینا ظلم ہے۔ اس کو وقت پر پیسے نہ دینا بھی ظلم ہے۔ بحیثیتِ انسان سب برابر ہیں‘ اس لیے اپنے آپ کو بہتر اور اپنے ملازم کو کمتر سمجھنا ظلم ہے۔ ملازم کو بلاوجہ ڈانٹنا یا جھڑکنا اور اسے اپنا حق سمجھنا ظلم ہے‘ اور اگر کوئی ملازم ہماری ڈانٹ پر کوئی جواب دے دے تو اس کی توہین و تذلیل کرنا بھی ظلم ہے۔ ملازم کے ساتھ ہمارا ہر روز کا واسطہ ہے‘ لہٰذا ان کے ساتھ عدل کریں‘ ظلم نہ کریں۔ ورنہ یہ وہ دانستہ یا نادانستہ مظالم ہیں جو ہم کندھوں پر اٹھائے میدانِ حشر میں جائیں گے۔ ہماری پوری زندگی کی وڈیو چلا دی جائے گی تو منہ سے اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ ’’اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ۔‘‘

ملازمین یا ماتحتوں کا ظلم: ملازمین یا ماتحتوں کا ظلم یہ ہے کہ ایک ملازم کو ہم نے کام کاج کے لیے معاوضے پر رکھا ہوا ہے‘ تو اگر وہ کام کرنے وقت پر نہ آئے‘ کام ٹھیک سے نہ کرے‘ بلاوجہ چھٹیاں کرے تو یقیناً وہ بے ایمانی اور خیانت سے کام لے رہا ہے۔ اپنی مالکہ کے ساتھ بلاوجہ جھگڑا کرنا اور ان کو کھری کھری سنانا‘ یقیناً اپنے مقام سے بڑھ جانا ہے اور یہ بھی ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود انسانوں کے مابین کچھ فضیلتیں اور درجہ بندیاں رکھ دی ہیں (مثلاً شوہر کو بیوی پر‘ والدین کو اولاد پر‘ استاد کو شاگرد پر‘ اسی طرح مالکہ کو ملازم پر وغیرہ) لیکن ساتھ ہی حدود بھی لگا دی ہیں کہ ع ’’جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے‘‘ — پھر یہ فضیلتیں صرف دنیا کی حد تک ہی ہیں‘ آخرت میں تو سب اپنے اعمال کا صلہ پائیں گے۔ ان فضیلتوں کو ہم اختیار بھی کر سکتے ہیں اور اختیار کا ناجائز اور غلط استعمال ہی ظلم کا سبب بنتا ہے‘ جو ہم سب اِلا ماشاءاللہ‘ کرتے رہتے ہیں۔

عورت کے مظالم بحیثیتِ والدہ

بچوں کی اُخروی زندگی کی تعلیم و تربیت کی بجائے محض دنیوی تعلیم و تربیت اور دنیا ہی کی کامیابی کے لیے بچوں کی پرورش کرنا حقیقت میں بہت بڑا ظلم ہے۔ کوئی والدہ بھی ایسی نہیں کہ اپنے بچوں سے پیار نہ کرتی ہو‘ لیکن جب خود مطمحِ نظر دنیا ہو تو بچوں کے لیے بھی لازماً وہی چیز پسند کی جاتی ہے۔ صرف نماز روزہ ہمیں نیک نہیں بناتا‘ ہماری پوری زندگی کے اعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم خود کون سا راستہ پسند کرتے ہیں۔ جو راستہ دل سے پسند کرتے ہیں وہی ہمارے اعمال بن جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم سب اپنے اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہم خواہی نہ خواہی خود اپنے اوپر بھی ظلم کر رہے ہوتے ہیں اور بچوں پر

بھی۔ اسی طرح والدہ کا لڑکوں کو لڑکیوں کی نسبت ترجیح دینا‘ یعنی ہر معاملے میں‘ چیز تقسیم کرنے کا معاملہ ہو یا محبت کا‘ باپ کی نسبت اپنے مقام کو بچوں کی نظر میں زیادہ سے زیادہ بڑھانا‘ اپنے بچوں کو اللہ کے حکم سے زیادہ اپنا حکم ماننے پر مجبور کرنا‘ سسرالی رشتہ داروں کی نسبت اپنے رشتہ داروں کی اہمیت بلاوجہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنا‘ یہ سب چھوٹی بڑی ظلم و زیادتی کی مثالیں ہیں۔ آغاز میں بیان کی گئی آیت (الانبیاء:۴۷) پر اگر توجہ دیں تو معلوم ہوگا کہ ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ظلم اور زیادتی اللہ کو پسند نہیں ہے۔ کسی کو مارنا پیٹنا یا قتل و غارت کرنا ہی ظلم نہیں ہے‘ بلکہ مندرجہ بالا سارے کام مظالم بن جاتے ہیں جو ہم ایک دوسرے پر کر رہے ہوتے ہیں کہ کسی بھی چیز‘ معاملہ‘ حقوق‘ فرائض وغیرہ کو اپنی جگہ اور مقام سے ہٹانے کی کوشش کرنا۔

ایک بہت بڑا ظلم جو ہم والدین اپنی اولاد پر کر رہے ہوتے ہیں‘ وراثت کی تقسیم کے ضمن میں ہے‘ جو ظلم کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکامات سے بغاوت بھی ہے کہ لڑکوں کو وراثت میں سے حصہ دینا اور لڑکیوں کو نہ دینا۔ کہیں رحمی رشتوں کے واسطے دینا‘ کہیں یہ کہہ دینا کہ ہم نے بیٹیوں کو جہیز میں اتنا دے دیا تھا‘ اب وراثت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ وراثت میں بھونڈی تقسیم کا نتیجہ تو ازروئے قرآن خلود فی النار اور دردناک عذاب ہے۔ (النساء:۱۴)

عورت کے مظالم بحیثیتِ بیوی

بیوی ہونے کی حیثیت سے عورت اپنے شوہر پر ظلم کرتے کرتے بھی خود کو ساری عمر مظلوم ہی سمجھتی ہے۔ شوہر کی مرضی کے بغیر اس کے مال کو خرچ کرنا‘ چیز سستی خرید کر شوہر کو مہنگے دام بتا کر بقیہ رقم چھپا لینا‘ شوہر کے حقوق جو اللہ تعالیٰ نے اس پر عائد کیے ہیں‘ وہ ادا نہ کرنا‘ شوہر کو وہ مقام اور عزت نہ دینا جو اللہ نے فضیلت کے اعتبار سے شوہر کے حق میں ایک درجہ رکھ دی ہے — اسی طرح ایک سبزی فروش سے لے کر ڈاکٹر تک کے ساتھ خوش اخلاقی سے بات کرنا‘ لیکن شوہر کے ساتھ روکھا پھیکا رویّہ اور بداخلاقی سے پیش آنا — یہ دن رات یعنی ہر وقت کا ظلم ہے جو ایک عورت خود اپنے آپ پر کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح شوہر کے علاوہ دوسروں کو بن سنور کر دکھانا‘ خصوصاً ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے (اور یہ کام ہم دیندار خواتین بھی بہت شوق سے کرتی ہیں کہ ہائے ڈاکٹر کیا کہے گا اپنے کو سنوار بھی نہ سکی) تاکہ ہم اس کی زیادہ توجہ حاصل کر سکیں اور علاج اچھا اور سستا ہو جائے۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ نبی مکرم ﷺ کے ارشاد کا مفہوم

یہ ہے کہ عورت کا اپنے شوہر کے علاوہ دوسروں کے سامنے بناؤ سنگھار کرنا ایسا ہے گویا قیامت کے دن کا اندھیرا۔ ہم خود اپنے آپ سے سرزد ہونے والے مظالم کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے 'ظلم' کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ لیکن قرآن کی آیات کو (ترجمے کے ساتھ) بار بار پڑھتے رہنے سے اور ظلم کی تعریف اور تشریح سے انسان کا دل و دماغ کھلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زندگی ان ناانصافیوں اور ظلم و زیادتی سے بھری پڑی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۱۶۰﴾ (الاعراف) ''اور انہوں نے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا بلکہ وہ اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے رہے۔''

اولاد کے مظالم

اولاد اگر ماں باپ کا معروف میں کہنا نہیں مانتی' ان کا ادب نہیں کرتی' ان کے ساتھ گھر کے کام کاج میں اپنا حصہ نہیں ڈالتی' ان کے سامنے عاجزی سے نہیں رہتی' خوش اخلاقی سے پیش نہیں آتی' جس کے وہ از روئے قرآن و حدیث مستحق ٹھہرائے گئے ہیں تو وہ خود پر ظلم کرتی ہے' بلکہ گناہِ کبیرہ کی مرتکب ہو رہی ہے۔ شادی سے پہلے بیٹی یا بیٹا کا اپنے والدین کا حکم ماننا (معروف میں) فرض ہے۔ شادی کے بعد بیٹی کا اپنے ماں باپ کے فرائض ادا کرنا ثانوی رہ جاتا ہے جبکہ بیٹے پر یہ ذمہ داری تاحیات باقی رہتی ہے۔ اور یہ سب فرائض ہیں جو اگر وہ ادا کرتا ہے تو ماں باپ پر کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ اپنی ذمہ داری ادا کر رہا ہے۔ اور اگر نہیں کرتا یا اپنا فرض کسی اور پر بلاوجہ ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے تو اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ یہ ظلم وہ دو طرح سے کر رہا ہوتا ہے۔ ایک تو اپنے فرض کو اپنے اوپر سے اتارنے کی کوشش کرنا۔ دوسرا ''وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ'' کے مصداق' اپنے فرض کو کسی اور کا فرض قرار دینا۔ (اور یہ ظلم وہ اپنی غیر شادی شدہ بہن پر نہیں کر سکتا' لہٰذا بیوی پر ہی زور چلتا ہے۔)

اولاد اگر بے راہروی اختیار کر کے والدین کی رسوائی کا سامان کرتی ہے تو یہ بھی ظلم ہے۔ خصوصاً آج کل جو بیٹیاں گھروں سے بھاگ کر پسند کی شادی کر لیتی ہیں وہ والدین کو زندہ درگور کر دیتی ہیں۔ یہ ان کی طرف سے والدین پر بہت بڑا ظلم ہے۔

عورت کے مظالم بحیثیتِ بہو

بہو اپنے شوہر کو اگر اُس کے والدین سے کاٹنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ نہ صرف ظلم بلکہ

قطع رحمی کی مرتکب ہوتی ہے۔ اگر جان بوجھ کر شوہر کے والدین کے حصے کا ٹائم بھی خود لینے کی کوشش کرتی ہے یا شوہر کو اپنی طرف ایسے مصروف رکھتی ہے کہ اس کی توجہ والدین سے ہٹ جائے تو وہ اپنے اوپر خود ظلم کر رہی ہے۔ اسی طرح شوہر کے والدین پر روپیہ پیسہ خرچ کرنے سے روکتی ہے' اگر زبانِ قال سے نہیں تو زبانِ حال سے اپنی ضروریات کا احساس بلاوجہ دلاتی رہتی ہے' تو ظلم کی مرتکب ہوتی ہے۔ اگر اپنے بچوں کی نظروں میں دادا دادی' پھوپھو' چچا تایا کا مقام بلاوجہ گرانے کی کوشش کرتی ہے اور اس کے برعکس اپنے والدین' خالہ' ماموں کے مقام کو بلاوجہ اونچا رکھتی ہے تو ظلم کرتی ہے۔ (درحقیقت کسی کا مقام گرا دینا' ہٹا دینا' کسی کا مقام اونچا کرنا جبکہ وہ اس کا مستحق نہ ہو' یہی تو ظلم ہے۔)

عورت کے مظالم بحیثیتِ ساس

عورت بحیثیت ساس ظلم کی مرتکب کیسے ہوتی ہے؟ ساس اگر بہو پر وہ ذمہ داری ڈال دے جو اللہ نے اس پر نہیں ڈالی تو یہ ظلم ہے۔ اسی طرح داماد کے سامنے سراپا حسن سلوک اور حسن اخلاق کی تصویر نظر آئے جبکہ داماد کی غیر موجودگی میں اس کو برا بھلا کہے۔ داماد کی بے جا تعریف' جس کا وہ مستحق بھی نہیں ہے' کرنا تاکہ اس کی بیٹی کے ساتھ وہ بہت اچھا رہے' جبکہ بہو کو بیٹے سے کاٹنے کی کوشش کرتے رہنا تاکہ ان کی آپس میں نبھ نہ سکے' دونوں میں کہیں اتفاق پیدا نہ ہو جائے' یہ ظلم ہے۔ اپنے پوتا پوتی کو اس نیت سے اپنے ساتھ چمٹانا' بے جا لاڈ پیار کرنا تاکہ وہ اپنی ماں کے بجائے صرف اپنی دادی کے ہو جائیں یقیناً بڑا ظلم ہے' کیونکہ ماں تو اپنے بچوں کی خاطر ہر قسم کی ذلت و رسوائی جھیل لیتی ہے' لیکن بچوں کی جدائی برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بچوں کو قابو میں کر کے بہو کو بلیک میل کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ لہٰذا ان بچوں کو ہتھیار بنا کر اپنے مفادات پورے کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔ اسی طرح گھر میں بیٹیاں ہوتے ہوئے خود بھی اور بیٹیاں بھی بستر پر یا ٹی وی کے آگے وقت گزاری کریں اور گھر کے تمام کام بہو کا فرض بنا کر اس کے کھاتے میں ڈال دینا کیا ظلم نہیں ہے؟ اور کیا یہ ہمارے گھروں میں نہیں ہو رہا ہے؟ اور جب بیٹا گھر میں آ جائے تو بہو کے کیے ہوئے کام بھی اپنے اور بیٹیوں کے کھاتے میں ڈال دینا اور یہ کہنا کہ یہ تو آرام ہی کرتی رہتی ہے' یہ ظلم تو کیا بہتان ہے —— اسی طرح بیٹے کو بہو کے خلاف بھڑکانا' بیٹے کو مصروف کیے رکھنا اور عین اُس وقت جب بیٹا بہو کو لے

کر باہر نکل رہا ہو (کسی بھی کام کی غرض سے) تو اپنے کام گنوانے شروع کر دینا کہ کسی طرح بیٹا بہو کا پروگرام کینسل ہو جائے‘ یہ سب مظالم ہیں۔

نبی اکرمﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ ((اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا)) ’’اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم‘‘۔ اس پر صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ آتی ہے لیکن ہم ظالم کی مدد کیسے کریں؟ آپﷺ نے فرمایا کہ ’’ظالم کو اس کے ظلم سے روک دینا ہی اس کی مدد ہے‘‘۔ (صحیح البخاری) اگر معاشرے میں اس قسم کے ظلم رائج ہوں (اور ہیں) تو پھر سب کا فرض بنتا ہے کہ ہم اس حدیث پر احسن طریقے سے عمل کریں۔ حسن اخلاق سے اپنے اعزہ واقرباء کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ دل میں خود کوئی انتقام کا رویہ یا سوچ نہ ہو‘ صرف اور صرف للّٰہیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے خود اپنے مظالم کا جائزہ لے کر دور کرنے کی کوشش کریں اور پھر دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کریں۔

بہت سی خواتین کو میری باتیں اچھی نہیں لگتیں‘ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ایسی نہ ہوں لیکن اگر اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں تو نظر آئے گا کہ ہمارے قرب وجوار میں یہ سب مظالم ہو رہے ہیں۔ ان مظالم کے کتنے ڈھیر ہیں جو ہم اپنے کندھوں پر اٹھائے لیے جا رہے ہیں قبر کی طرف! ضرورت صرف عدل اور انصاف کی ہے جو اپنی ذات سے لے کر خاندان‘ معاشرے اور ملک کی سطح پر قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم صدیوں کے بگاڑ کو لمحوں میں تو ٹھیک نہیں کر سکتے لیکن دل کی آنکھیں کھول کر اپنے آپ کو تو ٹھیک کر سکتے ہیں۔

ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ

دنیا میں ہر انسان اپنے آپ کو مظلوم و بے بس سمجھتا ہے‘ لیکن اگر ہم عدل وانصاف سے اپنا جائزہ لیں تو اس دنیا میں بھی ہمیں اپنے مظالم نظر آ سکتے ہیں۔ آخرت میں تو ہمارے منہ سے خود بخود نکل جائے گا کہ ہم ظالم ہیں! لہٰذا ہمیں اپنے اختیارات کو استعمال کرنے میں بہت احتیاط سے کام لینا ہو گا—— انسان اس دنیا میں حقوق و فرائض کے ساتھ بھیجا گیا ہے اور مقصدِ حیات رب کی بندگی ہے اور رب کی بندگی کا مطلب غلامی ہے تو ہم اپنے رب کے غلام ہیں اور اچھا غلام کبھی اپنے آقا کی نافرمانی نہیں کرتا بلکہ ہمہ وقت اپنے محسنِ حقیقی اور آقا کو راضی کرنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ اپنی استطاعت کے باوجود اپنے حق کو اللہ کی خاطر چھوڑ دینا اور

دوسرے کے حق کو پوری طرح ادا کرنا‘ اسی طرح حق کا پرچار کرتے رہنا اور حق بات نظر آ جانے پر اعترافِ جرم کر لینا یقیناً رب کو راضی کرنے کے اسباب میں سے ہیں۔ ظلم کو ختم کرنے والی چیز عدل ہے اور عدل انفرادیت سے لے کر اجتماعیت تک پر محیط ہے۔ چنانچہ اپنے حق کو چھوڑ دینا اور بار بار معاف کرنا بھی مخالف فریق کو مزید نڈر بنا دیتا ہے اور ظلم بڑھتا جاتا ہے۔ اسی لیے فرمانِ نبویؐ ہے کہ ’’ظالم کو ظلم سے روکنا اس کی مدد ہے‘‘۔

اسی طرح ﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا﴾ (الانعام:۱۵۲) یعنی زبان سے بھی عدل کی بات ہی نکالو کی تلقین کی گئی ہے۔ اور اگر عدل نہ کیا تو یقیناً ظلم کے دروازے کھلے رہیں گے۔ البتہ عدل کرنے میں سب سے پہلے خود اپنے ساتھ عدل کرنا پڑے گا اور عدل میں صبر کرنا لازمی چیز ہے جو عام طور پر ہم سب کو بہت مشکل لگتا ہے۔ ہم تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق عمل کرنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اپنے دنیاوی مفادات اور چودھراہٹوں کے سبب اور دین کی سمجھ بوجھ ہونے کے باوجود ایک انچ ہلنے کو تیار نہیں ہیں۔

سورۃ الحاقۃ میں گنہگار لوگوں کی ایک بہت خوفناک منظر کشی کی گئی ہے کہ گنہگار انسان اپنا اعمال نامہ دیکھ کر کہے گا: ﴿هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ۝۲۹﴾ ’’میرا اقتدار بھی مجھ سے چھن گیا‘‘ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم آج اس اختیار پر جو اللہ نے ہمیں دیا ہے‘ اس کے زعم میں ساری زندگی داؤ پر لگا دیتے ہیں اور عدل کی بجائے من مانیاں کر کے ظلم کے بوجھ لادے جا رہے ہیں۔ یہ تو ایک بہت ضروری اور انفرادی تصویر ہے جو یہاں نظر آتی ہے‘ ورنہ ہماری اجتماعیت کے مظالم تو نہ ختم ہونے والی داستان ہیں۔ یہ تصویر یہاں اس لیے دکھائی گئی ہے کہ ہم اس زندگی میں لمحہ بہ لمحہ اپنا محاسبہ کریں اور اپنی غلطیوں‘ کوتاہیوں اور ظلم وزیادتیوں کی معافی مانگتے رہیں اور آئندہ کے لیے ان سے باز آ جائیں‘ تاکہ کل قیامت کے دن جب اُٹھیں گے تو ایسا نہ ہو کہ ع ’’جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا‘‘۔ اور ہمارے منہ سے نکلے: ﴿يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝۴۰﴾ (النبا) ’’کاش کہ میں مٹی ہوتا!‘‘ کاش مجھے شرفِ انسانیت ملا ہی نہ ہوتا! اور ﴿يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝۲۷﴾ (الحاقۃ) ’’کاش کہ وہی موت قصّہ پاک کر دینے والی ہوتی!‘‘

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر قسم کے ظلم سے محفوظ رکھے اور لوگوں کے حقوق کو کما حقّہ ادا کرنے والا بنائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

❀❀❀

فقیہہ کون؟

مفتی اویس پاشا قرنی

آج ہمارے معاشرے میں لفظ فقہ، علم فقہ اور لفظ فقیہہ کے بہت سے مثبت اور منفی معنی پائے جاتے ہیں۔ بعض احباب فقہ کو ایک عظیم الشان علم اور اس کے حامل شخص کو فقیہہ کے طور پر جانتے اور مانتے ہیں اور یہی تصور صحیح بھی ہے۔ ایک دوسرا بگڑا ہوا تصور جو بعض اپنوں کی کوتاہیوں اور غیروں کی سازشوں کے نتیجے میں پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ یہ ایک ایسا علم ہے جس نے ہمیں قرآن وسنت سے دور کر دیا۔ ان کے نزدیک قرآن وسنت کے صحیح تر مفاہیم پر عجمی سازش کے نتیجے میں پائے جانے والے پردوں کو فقہ کہتے ہیں۔ یہ تصور گمراہ کن ہے اور ایک گمراہ طبقہ جو منکرینِ حدیث کے نام سے بدنام ہے، اس کے ہاں ایسے تصورات پائے جاتے ہیں۔

جو لوگ فقہ کا صحیح تصور رکھتے ہیں، لفظ فقیہہ کی عظمت کے بھی قائل ہیں اور فقیہہ النفس شخص کی عظمت کو بھی جانتے ہیں، اس علم سے وابستہ بھی ہیں، ان پر بھی اس لفظ کی وسعتیں اس طرح سے واضح نہیں ہوتیں جو بہر حال قرآن وسنّت میں بھی پائی جاتی ہیں اور ہمارے اسلاف کے ہاں بھی اس کے تذکرے معروف تھے۔ نبی اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں، اسی طرح صحابہ کرام ؓ کے عہدِ زریں میں اور مابعد کی تاریخ میں جس طرح سے اس لفظ کو واضح کیا گیا، اس کے فراموش کردہ مفاہیم بھی ہیں، جن پر از سرِنو توجّہات کو مرتکز کرنے کی ضرورت ہے۔ شاید آج اس میں ہمارے بہت سے امراض، پریشانیوں اور مشکلات کا علاج ہو۔ آج جس طرح ہر شے میں کوئی ایک انتہا کو چلا جاتا ہے اور بقیہ اطراف کو فراموش کر دیتا ہے، اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ مزاجوں میں اس طرح کی کچھ کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ تمام افراط وتفریط سے پاک اور تمام اطراف کو محیط مکمل تصور کو سامنے رکھا جائے اور بات واضح کی

☆ owaispasha@quranacademy.com

جائے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے بھی اس لفظ کو وسیع تر معنوں میں استعمال فرمایا۔ اسی طرح قرآن حکیم میں اس لفظ کا استعمال وسیع ہے۔

ایک تو گمراہی کا پہلو یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ جو تصورات رائج اور مروّج ہیں وہ اپنی جگہ درست نہیں ہیں، لفظ فقہ کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کی نفی ہو اور کسی اور معنی کا دعویٰ ہو، یہ ایک اور غلط تصور ہے۔ اس سے گمراہی اور کج فہمی کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے۔ صحیح تر بات یہ ہے کہ الحمدللہ، یہ تصورات درست ہیں۔ وہ علم جو دلائل تفصیلیہ سے بحث کرتا ہے، شریعت کے احکام کو متعین کرتا ہے، ہمارے لیے روز مرہ کی زندگی میں قرآن وسنت کی تاویلات کو واضح کرتا ہے، اسے علم فقہ کہتے ہیں اور اس علم کو باقاعدہ مدوّن ومرتب کیا گیا ہے، بڑے بڑے فقہاء اور علماء گزرے ہیں۔ مگر اس معنیٰ کو وسعت دیتے ہوئے اور اس فہم کو مکمل کرتے ہوئے ہمارے اسلاف نے بعض اور مفاہیم کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ آج ہم بدقسمتی سے ان مفاہیم کو فراموش کر جاتے ہیں۔ نتیجتاً ہم پر ایک تنگ نظری، کج فہمی سی، کچھ سوقیانہ اور روکھا، پھیکا اور تیکھا انداز چھا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اس علم کے تقاضے بھی پورے نہیں ہو پاتے۔ علم فقہ اور فقیہہ کی جو جلالتِ شان ہوا کرتی تھی اس سے بھی ہم محروم رہ جاتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مضامین کو بھی تازہ کیا جائے۔

علمِ دین کے حصول سے منسلک طلبہ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، وہ جانتے ہیں کہ جو لفظ اصطلاحی معنیٰ رکھنے کا حامل ہے، اس کی تفصیل اسی طرح سے ہوتی ہے کہ ایک لغوی معنیٰ ہے اور ایک اصطلاحی معنیٰ ہے۔ فقہ کے لغوی معنیٰ فہم وتدبّر کے ہیں۔ صرف جان لینا یا سمجھ لینا کے لیے فقہ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا، بلکہ گہرائی کے ساتھ کسی شے کو سمجھنے کے لیے لفظ فقہ استعمال ہوتا ہے۔ کوئی کہے عَلِمْتُ: میں نے جان لیا۔ فَهِمْتُ: میں نے اس کو سمجھ بھی لیا، مگر جب وہ کہے فقہتُ: اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس بات کو ایسے سمجھ لیا جو کچھ مالہٗ اور ماعلیہ ہے، جو کچھ اس کے حق میں ہے اور جو کچھ اس کے خلاف ہے، ان سب کا احاطہ کیا ہے اور ایک جامع اور مانع تصورِ علمی قائم کر لیا ہے۔ اس کے لیے لفظ فقہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ صرف علم وفہم پر محیط نہیں ہے، بلکہ اس فہم سے متعارف تمام چیزوں کو حل کر کے ایک نتیجے تک پہنچ جانا ہے۔ ان لغوی معنی میں یہ لفظ قرآن حکیم میں بھی استعمال ہوا ہے اور اس سے بھی اس کے وسیع تر معنی کی طرف

اشارہ ہوتا ہے۔ باقی اصطلاحی تعریف آپ جانتے ہیں کہ وہ علم جو کہ ہمارے روزمرہ کے دینی امور کو قرآن وسنت کے مطابق واضح کرنے والا ہے' اسے فقہ کہتے ہیں۔ لہٰذا اس کے اصطلاحی اور لغوی معنیٰ میں فرق ہے۔

''مفردات'' میں امام راغبؒ نے اس لفظ کی تعریف اس طرح سے کی ہے کہ فقہ اصل میں علم شاہد سے علم غائب تک پہنچ جانا ہے' یعنی آثار وقرائن کو دیکھ کر انسان پہچان جائے کہ نتیجہ یہ نکلے گا۔ مثال کے طور پر ابھی موسم اس طرح کا ہو رہا تھا جس سے یہ آثار نمایاں تھے کہ بارانِ رحمت برس سکتی ہے۔ تو کوئی شخص ان آثار کو دیکھ کر نتیجے پر غور کر رہا ہو کہ ہوسکتا ہے کچھ دیر میں بارش ہوجائے' اسے ہم اس کا گہرا پہلو کہیں گے۔ لفظ فقہ اصطلاحی معنوں میں سورۃ التوبہ میں استعمال کیا گیا۔ فرمایا:

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ (آیت۱۲۲)

''کیوں ایسا نہیں ہوا کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت نکلتی' (وہ لوگ آکر حضور ﷺ کے پاس مقیم ہوتے' آپ کی مجلس میں مستفید ہوتے) تاکہ وہ دین میں گہری سمجھ بوجھ پیدا کرتے!''

جن کے لیے قرآن ''الرّٰسِخُون فی العِلم'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے' یعنی وہ لوگ جو علم میں رسوخ رکھنے والے ہیں۔ یہی لفظ اصطلاحی معنیٰ سے ہٹ کر لغوی استعمال میں اپنی اور وسعتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ سورۃ الانعام میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ﴾ (آیت۲۵)

''(اے نبی ﷺ!) ان سامعین میں سے بعض ایسے ہیں جو کان لگا کر آپ کی بات کو سنتے ہیں' مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر ایک پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ ان کو سمجھ نہیں سکتے اور ان کے کانوں میں ہم نے ثقل پیدا کر دیا ہے۔''

سنتے تو بہت غور سے ہیں لیکن نتائج تک نہیں پہنچتے۔ یعنی یہ آیات جو ان پر تلاوت کی جا رہی ہیں' سعادتِ دارین کا ذریعہ ہیں' ان میں دنیا وآخرت کی کامیابی مضمر ہے۔ خاص طور پر آخرت پر فوکس کر کے ان آیاتِ بینات کو سمجھنا اور اپنی زندگی کو تبدیل کر لینا' یہ وصف ان میں نہیں پایا جاتا۔ ورنہ کیا انہیں عربی نہیں آتی تھی؟ یہاں تفقّہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ آخرت کی طرف راغب

نہیں ہو رہے تھے۔ وہ اپنی دنیاداری اور چودھراہٹ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ دنیا کی محبت نے انہیں اندھا کیا ہوا تھا اور وہ حقیقت دیکھ نہیں رہے تھے۔ اسی طرح سورۃ الانعام کی آیت ۶۵ میں بتایا گیا کہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ اللہ جس طرح سے چاہے تم پر عذاب برپا کردے' تمہارے سروں کے اوپر سے طوفانِ بادوباراں کے ذریعے یا پیروں کے نیچے سے زلزلوں کے ذریعے یا اور وہ چاہے تو تمہیں گروہوں میں بانٹ کر لڑا دے اور ایک دوسرے کی قوت کا مزا چکھا دے۔ اس کے بعد فرمایا: ﴿اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝۶۵﴾ (الانعام) ''دیکھئے کس طرح ہم پھیر پھیر کر اپنی آیات کو واضح کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ سمجھیں''۔ اپنی موجودہ کیفیات پر غور کریں اور نتائج تک پہنچیں۔ یعنی اس بداعمالی کا نتیجہ جہنم ہے۔ اسے یہاں فقہ اور تفقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح سورۃ الانعام آیت ۹۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ﴾

''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا' اس کے بعد تمہارے لیے ایک تو مستقل ٹھکانہ ہے اور ایک عارضی جگہ ہے جہاں تمہیں رکھ دیا جائے گا۔''

اس آیت کی کئی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ متعلقہ تفسیر یہ ہے کہ یہاں ہمیشہ نہیں رہنا ہے۔ موت کے بعد تم کچھ عرصے قبر میں رکھے جاؤ گے اور اس کے بعد آخرت کی عظیم زندگی ہے جو ہمیشہ کے لیے کوئی نہ کوئی نتیجہ ظاہر کرے گی۔ یہ ذکر کر کے فرمایا: ﴿قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝۹۸﴾ (الانعام) ''تحقیق ہم نے آیات کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے ان لوگوں کے لیے جو تفقہ رکھتے ہیں۔''

علم فقہ تو اعمال کے ظاہر سے بحث کرتا ہے' لیکن اپنے بعض مفاہیم اور وسعتوں کے اعتبار سے ان اعمال کے نتائج سے بھی بحث کرتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ڮ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ......﴾ (آیت۱۷۹)

''اور ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیے ہیں بہت سے جن اور انسان (یعنی ان کے اعمال ایسے ہیں کہ وہ آخرکار جہنم میں جائیں گے) اس لیے کہ ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے غور وفکر نہیں کرتے......''

یعنی اس سے روحانی پیاس محسوس نہیں کرتے‘ نتائج اخذ نہیں کرتے۔ اب یہاں وہ اصطلاحی علم فقہ کے استعمال کا ذکر نہیں ہو رہا۔ یہاں مراد راغب ہو جانا ہے اعمال وعبادات اور آخرت اور اس کی ابدی زندگی کی جانب۔ سورۃ الانفال کی آیت ۶۵ میں ارشاد ہوا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ ؕ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾﴾

’’اے نبی! (ﷺ) مسلمانوں کو قتال کی طرف راغب کیجیے۔ (اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس طرح سے ایمانی قوت کے ساتھ مزین اور مسلح کیا ہے کہ) اگر تم میں سے بیس افراد بھی صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں گے تو وہ دوسو افراد پر غالب آ کر رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے سو افراد (ثابت قدم) ہوں گے تو وہ کفار کے ایک ہزار افراد پر غالب آ جائیں گے‘ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو جانتے نہیں ہیں۔‘‘

کفار یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی زندگی حقیقی ہے‘ اس لیے وہ بے جگری سے نہیں لڑتے۔ ان میں شہادت کی آرزو نہیں ہوتی بلکہ وہ زندہ رہنے کے لیے لڑتے ہیں۔ اہل ایمان جب بے جگری سے لڑتے ہیں تو زیادہ تعداد پر غالب آتے ہیں‘ جبکہ کفار کا زیادہ ہونا بھی انہیں فائدہ نہیں دیتا کہ وہ حقیقتِ حیات سے واقف نہیں ہیں۔ یہی تفقہ ہے کہ قرآن کا خلاصہ سمجھا جائے کہ یہ حقیقی زندگی نہیں ہے‘ اسے ختم ہو جانا ہے۔ جو شے مجھے وہاں جلدی سے پہنچا دے‘ جہاں ہمیں انعام و اکرام سے نوازا جائے وہ شہادت ہے۔ اسی طرح اور بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ نے لفظ تفقہ کو استعمال کیا۔ سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ یہ زندگی حقیقت ہے یا آخرت کی زندگی؟ اور اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیا الل ٹپ ہو رہا ہے یا کسی مدبر وحاکم حقیقی کے حکم سے ہو رہا ہے؟ جو کچھ میں کروں گا کیا اس کے کچھ نتائج بھی نکلیں گے یا نہیں؟

ایک بڑی پیاری روایت ہے کہ ایک اعرابیؓ نبی ﷺ کے پاس آتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے کچھ نصیحت کیجیے۔ زیادہ طویل نصیحت نہ فرمایئے گا‘ اس لیے کہ میں بوڑھا ہوں اور بہت ساری باتیں یاد نہیں رکھ سکتا۔ حضور ﷺ نے قرآن حکیم کی دو آیات ان کو سنائیں: ﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ﴿۷﴾ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ﴿۸﴾﴾ (الزلزال) کہ جو شخص تھوڑا سا بھی اچھا عمل کرے گا اسے روزِ قیامت دیکھ لے گا اور جو شخص تھوڑا

سا بھی برا عمل کرے گا تو روزِ قیامت اسے بھی دیکھ لے گا۔ اس اعرابی نے جب یہ الفاظ سنے تو کہنے لگے کہ یارسول اللہ ﷺ! یہی کافی ہے‘ میں اس پر عمل کروں گا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس برجستہ ردِعمل پر تبصرہ فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے جو تفقہ رکھتا ہے۔

جو شخص اپنے اعمال کی جواب دہی سے عاری ہو گیا اگرچہ وہ بہت سارے علوم کا جاننے والا ہو‘ تو بھی وہ کچھ نہیں جانتا۔ اصل سمجھ تو آخرت میں جواب دہی کا احساس ہے‘ ورنہ دنیا میں سمجھ کے نتیجے میں کچھ مالی فائدہ ہو جاتا ہے یا انسان کسی نقصان سے بچ جاتا ہے۔ اس سمجھ کا کیا کرنا جو زمین سے ایک گز نیچے جانے کے بعد کام نہیں آئے گی! متاع الغرور کے چھن جانے کے بعد کچھ کام نہیں دے گی! وہ عقل جس کو عقل سمجھ کر انسان پوری زندگی بے عقلی میں گزار دیتا ہے‘ اس سے اسے کیا حاصل ہو گا؟

اصطلاحی تفقہ کا احادیث مبارکہ میں کثرت کے ساتھ تذکرہ آتا ہے۔ حضرت معاویہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُّفَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ)) (متفق علیه)

’’اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا معاملہ فرماتا ہے اسے دین میں تفقہ عطا فرما دیتا ہے۔‘‘

اس لیے کہ علم تو دین کی ماں ہے۔ یہ دین اس کے لیے واقعی دستیاب ہوتا ہے جس کے پاس علم ہو۔ علم کے بغیر جہالت ہے اور جہالت کے ذریعے کوئی عمل سیدھا نہیں ہوا کرتا۔ دین کا تفقہ ہو گا تو اعمال بھی نتائج خیز ہوں گے۔ یہاں پر اس شے کی جانب متوجہ کرنا ہے کہ انسان کو صورت مل جائے اور حقیقت غائب ہو جائے تو کیا فائدہ؟ جس طرح کسی کا جسد موجود ہو لیکن روح پرواز کر چکی ہو تو اسے میّت کہتے ہیں‘ اسی طرح کسی کے پاس علم کی بہت ساری باتیں ہوں‘ لیکن یہ باتیں صرف زبان تک رہیں‘ نہ اس کے دل میں اتریں اور نہ اس کے اعمال کو تبدیل کریں‘ اور وہ علم جو کسی کی معاشرت‘ معیشت اور سیاست کو تبدیل نہ کرے تو یہ علم فقہ نہیں ہے۔

تفقہ کی اہمیت کو نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے خوب واضح فرمایا ہے۔ آیت قرآنی ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾﴾ (التوبة) ’’اللہ والے بن جاؤ!‘‘ کی شرح میں حضرت ابن عباس ؓ کا ایک اثر ہے جسے امام بخاریؒ کتاب العلم میں لے کر آئے ہیں کہ ’’علماء وفقهاء‘ حلم والے بن جاؤ!‘‘ پچھلی امت کی طرح اللہ والے کا معنیٰ رہبانیت

اختیار کرنے والے نہیں‘ بلکہ ہمارے دین نے اس کا ایک معنیٰ متعین کیا ہے‘ وہ علماء وفقہاء ہیں۔ یعنی علماء وفقہاء کے پاس حلم بھی ہو اور تفقہ بھی ہو۔ بہت ساری چیزوں کو صرف جان لینا علم نہیں ہے۔ یہ معلوم ہو کہ کون سی شے کہاں استعمال ہوتی ہے۔ اگر آپ کو کوئی ڈِش پکانی ہے تو غذائی اجناس کے گودام سے ہر شے تناسب میں لائی جائے گی اور اپنے تناسب میں استعمال کی جائے گی۔ کسی کھانے میں نمک کتنا پڑتا ہے‘ مرچ کتنی ڈالی جاتی ہے‘ اس کے علاوہ بقیہ اجزاء کس تناسب سے ہونے چاہئیں‘ سب کچھ معلوم ہو۔ صرف اشیاء کے خواص ہی معلوم نہ ہوں بلکہ حسنِ ترکیب وترتیب بھی معلوم ہو۔

دین میں کیا شے پہلے ہے اور کیا بعد‘ ان ساری چیزوں کو جاننے اور سمجھنے کو تفقہ کہتے ہیں۔ مگر وہ تفقہ جو تحمل سے عاری ہو‘ نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ آج ہمارا المیہ بالخصوص دیندار طبقوں کا یہ ہے کہ ہم اَسلاف کے علم کے وارث تو ہو گئے ہیں‘ حلم کے وارث نہ ہو سکے۔ ہمارے اسلاف علم کے ساتھ حلم بھی رکھتے تھے۔ آج ہم صرف علم رکھتے ہیں‘ لیکن وہ حلم و بردباری جس سے علم کارگر ہوتا ہے‘ اس سے عاری ہو گئے ہیں۔ اسی لیے حافظ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ کسی شے نے کسی شے کو اتنی زینت نہیں دی جتنی علم کو حلم نے زینت دی ہے۔ امام بخاریؒ مزید فرماتے ہیں کہ ربانی وہ ہے جو لوگوں کو پہلے چھوٹی چھوٹی پھر بڑی چیزوں کے علم کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ یک بارگی سب کچھ نہیں بتا دیتا اور طلبہ کو فارغ نہیں کر دیتا۔ حضرت عائشہ صدیقہ ﷞ فرماتی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ پہلے ہی دن کہہ دیتا کہ یہ اور یہ چھوڑ دو‘ یہ حرام ہے اور وہ حرام ہے! تو خدا کی قسم‘ اصحابِ رسول یہ کہہ پڑتے کہ ہم نہیں کر سکتے۔ مگر اللہ کی حکمت دیکھو کہ کس تدریج کے ساتھ چیزیں حرام کیں اور اس انداز میں شریعت کو مکمل کیا کہ صحابہ کرام ﷡ نے خود پوچھ پوچھ کر حرمت کو ثابت کروایا ہے۔ آج لوگ کہتے ہیں کہ کسی دینی مجلس میں مت بیٹھو کہ اگر علم حاصل ہو جائے گا تو عمل کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ آج ایمان نہیں بنے ہوئے ہیں۔ لوگوں میں آخرت کی تڑپ نہیں ہے۔

یہ فقہ اور تفقّہ کا ایک پوشیدہ گوشہ یا فراموش کردہ پہلو ہے کہ فقیہہ کون ہے؟ آج سمجھا جاتا ہے کہ فقیہہ یا بڑا عالم وہ ہے جس سے جو سوال کیا جائے وہ اس کا جواب دے دے۔ ایک تابعی ابن ابی ملیکہؒ فرماتے ہیں کہ ہر سوال کا جواب دینے والے یا تو رسولؐ ہو سکتے ہیں یا کوئی

بیوقوف شخص ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس چونکہ وحی آتی تھی لہٰذا وہ ہر سوال کا جواب دے سکتے تھے۔ چونکہ ہر علم کسی ایک ذہن میں جمع نہیں ہو سکتا لہٰذا کوئی بیوقوف شخص ہی ہو سکتا ہے جو ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کرے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ سوال کا جواب نہ دیا جائے تو یہ ان کی عزت کا مسئلہ بن جائے گا‘ لہٰذا وہ اپنی طرف سے جو چاہیں فوراً کہہ دیتے ہیں۔ صحابہ کرام ﷡ تابعینؒ کی تربیت کرنے والے تھے۔ وہ خود رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ تھے۔ حضرت ابن عباس ﷠ فرماتے ہیں کہ جو شخص علم میں سے کچھ جانتا ہے تو اسے چاہیے کہ اس کے مطابق بات کرے۔ یعنی وہ جس درجے پر ہے‘ علمِ قطعیات میں سے ہے‘ فرائض و واجبات میں سے ہے تو ہر شخص اس کو آگے پہنچانے والا ہوگا۔ اس میں کچھ علمی تفصیلات پائی جاتی ہیں تو علماء بتائیں گے‘ جو اہلِ افتاء ہیں وہ فتویٰ بتائیں گے۔ جو دعوت کا کام کرنے والے ہیں وہ بات کو دعوتی انداز میں بتائیں گے۔ آگے ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جو نہ جانتا ہو تو کہہ دے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک شخص کے فقیہہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ جس بات کو وہ نہ جانتا ہو تو کہہ دے کہ اللہ بہتر جانتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اللہ کی عطا سے جانتے ہیں۔ انبیاء کرام ﷩ نے جو کچھ بتایا اللہ کی عطا سے بتایا۔

اس میں بھی کچھ تفصیلات اور کچھ جزئیات ہوتی ہیں‘ تو ہر موقع پر ہر سوال کا جواب دینا کوئی ضروری نہیں ہے۔ آج فتنہ یہ ہے کہ ہر شخص مفتی بنا ہوا ہے۔ کسی مجلس میں گفتگو شروع ہوئی تو قطعیت کے ساتھ کہہ دیا کہ فلاں تو کافر ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ لوگوں کے کفر کے بارے میں فیصلہ کرنے والے آپ اور ہم کون ہوتے ہیں؟ کسی شے کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو بالکل حرام ہے اور اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی بات کو سنا تو کہہ دیا کہ یہ تو حدیث ہو ہی نہیں سکتی۔ کسی آیت کو سنا تو کہہ دیا کہ اللہ تو ایسا کہہ ہی نہیں سکتا۔ اپنے آپ کو عقلِ کُل بنا لیا جاتا ہے۔ کسی شعبے میں اس طرح نہیں ہوتا۔ قرآن وسنت کی تعلیم یہ ہے کہ اگر تم جانتے ہو تو اس پر عمل کرو اور اگر نہیں جانتے تو اس کے جاننے والے کی طرف اسے لوٹا دو۔ جاننے والوں کو طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہر داڑھی والا دین کا ہر علم جانتا ہو‘ اس سے پوچھ لیا گیا تو لازماً بتائے گا۔ صحابہ کرام ﷡ اس سے بہت زیادہ بچا کرتے تھے۔ کسی سے سوال کیا جاتا تو وہ دوسرے صحابی کے پاس بھیج دیتے تھے اور اس

طرح تیس افراد تک سے پوچھے جانے کے بعد مسئلہ پہلے کے پاس واپس آ جاتا۔ ان کی حساسیت کا یہ حال تھا۔ آج کل ہر کوئی بتانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی جانتا بھی ہے تو یہ لازم تو نہیں کہ اسی وقت جواب دے دے' لیکن پوچھنے والے فوراً جواب چاہتے ہیں۔ بیشک یہ کمپیوٹر کا دور ہے لیکن علم دین بہر حال انسانوں سے انسانوں کو منتقل ہوتا ہے' انسانی ذہن اس میں کام کرتا ہے۔ خواہ وہ کمپیوٹر سے معلومات حاصل کرے' تاہم درست جواب تک پہنچنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ لہٰذا فوراً جواب طلب کرنا بھی درست نہیں ہے۔ جواب دینے والا بھی آزمائش میں پڑ جاتا ہے کہ اگر اس نے فوری جواب نہ دیا تو لوگ کہیں گے کہ اسے پتہ ہی کچھ نہیں اور پڑھانے کو بیٹھ گیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کے ہاں یہ بات بہت مشہور تھی۔ کہتے تھے کہ اگر کوئی دینی مسئلہ پوچھ لے تو یہ بات سامنے رکھو کہ تم اللہ اور اُس کے بندے کے درمیان واسطہ بن رہے ہو۔ جو کچھ تم بتا رہے ہو وہ اللہ کی طرف سے بتا رہے ہو۔ جواب اپنا حاضر رکھو اس دن کے لیے جب اللہ سوال کرے گا کہ وہ بات کیوں کہی جو تم جانتے نہ تھے؟ لہٰذا اگر اسے علم نہ ہو تو کہے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ ایک فقیہہ کی علامت ہے۔

ایک اور پہلو دیکھیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ بیشک وہ فقیہہ حقِ فقہ ادا کرنے والا ہے جو لوگوں کو مایوس نہیں کرتا۔ قرآن کہتا ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ﴾ (الزمر:۵۳)

''(اے نبیﷺ!) کہہ دیجیے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے خود پر ظلم کیا ہے' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تو سارے گناہوں کو معاف کرنے پر قادر ہے۔''

فقیہہ یہ نہ کہے کہ تمہاری بخشش نہیں ہو سکتی۔ فقیہہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں کرتا اور لوگوں کو اللہ کی معصیت میں رخصت تلاش کر کے نہیں دیتا۔ آج لوگ علماء سے سوال کرتے ہیں کہ میں نے یہ کام کرنا ہے' کوئی طریقہ بتا دیجیے کہ کیسے کروں! یہ لوگ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ جب بتایا جائے کہ سود حرام ہے تو پوچھتے ہیں کہ اس کا متبادل بتائیں۔ اور اگر کہا جائے کہ اس کا کوئی متبادل نہیں تو کہتے ہیں کہ آپ تو عالم ہی نہیں ہیں' آپ لوگوں کو پتھروں اور غاروں کے زمانے میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ علم نام ہے اللہ کی بات مان کر چلنے کا۔ علم یہ نہیں کہ ہر خواہش کو کسی طرح

بھی پورا کیا جائے اور اگر معلوم نہ ہو تو عالم اس کے بارے میں حیلے تراش کر بتائے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر پچھلی امتوں پر عذاب آیا کرتا تھا۔ حدیث میں متنبہ کیا گیا ہے کہ قربِ قیامت میں ایسا ہو گا کہ لوگ شراب اس کا نام تبدیل کر کے پئیں گے۔ اسی طرح سود اس کا نام تبدیل کر کے کھائیں گے۔ آج یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

کسی کے فقیہہ ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے عذاب سے مامون نہ کر دے۔ کہیں ایسا ہو گا کہ لوگوں کو اللہ کی آیات سنا کر اتنا ڈرایا جائے گا کہ لوگ مایوس ہو جائیں۔ اور کہیں ایسا ہو گا کہ اللہ کی رحمت کی اتنی آیات سنائی جائیں گی کہ لوگ یہ سمجھیں کہ وہ جو کچھ بھی کرتے رہیں' بخشے بخشائے ہیں۔ ایمان نام ہے خوف اور امید کے درمیانی کیفیت کا۔ کسی نے کیا خوب کہا کہ جوانی کے ایام میں جب بندے کی توانائیاں مضبوط ہوں' اللہ کے عذاب کو پیش نظر رکھے۔ بڑھاپے میں اللہ کی رحمت کی زیادہ سے زیادہ امید رکھے۔ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ ایمان اسی شے کا نام ہے کہ جو امید اور خوف کے مابین پایا جاتا ہو۔

فقیہہ وہ ہے جو قرآن سے بے رغبتی اختیار کر کے کسی اور جانب متوجہ نہ ہو جائے۔ وہ سب سے زیادہ رغبت قرآن سے رکھنے والا ہو۔ اگر کسی کی زندگی میں قرآن کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہے تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ وہ حق تفقّہ رکھنے والا نہیں ہے' اس کی عبادت میں کوئی خیر نہیں ہے۔ بے علمی کے ساتھ عبادات اصل میں بدعات ہوا کرتی ہیں۔ سنن دارمی میں یہ بات حضرت علیؓ کے قول کے طور پر نقل ہوئی ہے کہ کسی قراءت میں بھی کوئی خیر نہیں ہے جو بغیر تدبّر کے ہو۔ غور و فکر کے ساتھ قرآن کا پڑھنا تفقّہ کا تقاضا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہم علم کیا حاصل کریں' عمر بڑھ گئی ہے۔ اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ علم تو بچپن ہی میں حاصل کرنے کی شے تھی۔ یا یہ کہ کوئی خاص مقام و مرتبے پر آ جائے تو کہتا ہے کہ اب علم کے حصول کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا یہ قول بخاری شریف میں نقل ہوا ہے کہ تفقّہ پیدا کرو اس سے پہلے کہ تم کوئی منصب دیے جاؤ۔ اور ایک ترجمہ اس کا یہ بھی کیا گیا ہے کہ اپنے اندر فہم پیدا کرو اس سے پہلے کہ تم بڑی عمر کو پہنچ جاؤ۔ اس قول کو نقل کر کے خود امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی ذمہ داری دے دیے جاؤ یا بڑی عمر کو پہنچ جاؤ تو اس کے بعد بھی علم حاصل کرو۔

(باقی صفحہ 98 پر)

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۱۲)

مرتّب: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

☆

حضرت مولانا محمد یوسفؒ (امیر تبلیغی جماعت) اور اباجی

(گزشتہ سے پیوستہ)

اباجی بتاتے تھے کہ ہندوستان کے لیے تبلیغ کی جو پہلی پیدل جماعت نکلی‘ اس میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا۔ اباجی کی دستیاب ڈائریوں میں ۱۹۴۷ء میں دعوت وتبلیغ کے کام میں شرکت اور تبلیغی جماعت سے بھرپور وابستگی کا ذکر ملتا ہے۔ بلال پارک اور آسٹریلیا مسجد‘ نزد ریلوے اسٹیشن‘ لاہور میں رفقاء کے ہمراہ جمعرات کا اجتماع اور پھر شب باشی بھی جاری رہی۔ اس سال کا رمضان المبارک اباجی نے کوئٹہ میں گزارا‘ ساتھ ساتھ تبلیغی کام بھی جاری رہا۔ حضرت جی سے اباجی کا اتنا تعلق تھا کہ جب مارچ ۱۹۴۸ء میں اباجی کے بڑے بھائی (تایا جی محمد فاضل) نے علالت کے بعد انتقال کیا تو حضرت جی رائے ونڈ کے سالانہ تبلیغی اجتماع کے لیے لاہور پہنچے ہی تھے‘ رفقاء سے اطلاع ملنے پر خود تشریف لا کر نماز جنازہ پڑھائی اور تسلی دے کر رخصت ہوئے۔ مارچ ۱۹۴۸ء کی ایک تحریر کی رو سے تجربہ کے پیش نظر یہ تجویز ہوا کہ مرکز (غالباً رائے ونڈ) میں چند پرانے تجربہ کار آدمی مستقل رہیں اور وہ تحریک دعوت وتبلیغ کی رہنمائی کریں۔ جماعتوں کے امیر بھی تجربہ کار لوگ ہوں‘ اس لیے ابھی جماعتوں کی بہت زیادہ نقل وحرکت کو روکا جائے اور کام لاہور سے صرف پنجاب میں ہی پھیلایا جائے۔ سندھ کو کراچی اور سرحد کو پشاور کی نگرانی میں چھوڑا جائے۔ اس وقت اباجی کا تبلیغ سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ پرانے رفقاء نے اباجی کو عالمی مرکز تبلیغ‘ نظام الدین چلنے اور ٹھہرنے کو کہا‘ لیکن چند دیگر مصروفیات کی بنا پر یہ

ممکن نہ ہوسکا۔

اپریل ۱۹۴۸ء میں اباجی کے تبلیغی چِلّہ لگانے کا ذکر ہے۔ آپ نے پشاور‘ کوہاٹ‘ بنوں‘ قبائلی علاقہ‘ ڈیرہ اسماعیل خان اور دہلی وقت لگایا۔ بستی نظام الدین‘ حضرت جی کے ہاں بھی قیام پذیر رہے۔ جون ۱۹۵۰ء میں اباجی اور بڑے بھائی جان ۲۱ نفوس کے ہمراہ تبلیغی جماعت کی طرف سے بذریعہ بحر و بر سفرحج پر روانہ ہوئے۔ ۹ آدمی بحرین سے شامل ہوگئے اور کُل ۳۰ افراد پر مشتمل جماعت منزلِ مقصود تک پہنچی۔ وہاں بھی اباجی کی مع رفقاء تبلیغی اور دعوتی سرگرمیاں جاری رہیں۔ حج کے بعد باقی جماعت تو واپس ہوئی مگر اباجی‘ بھائی جان اور مزید ایک ساتھی نے اگلے حج تک وہیں قیام کا ارادہ کر کے ایک رباط میں کمرہ کرائے پر حاصل کر لیا۔ انہی دنوں سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) بھی وہاں حج کے بعد ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک موقع پر ان سے ہندوستان‘ پاکستان اور حجاز میں تبلیغی کام پر تبادلہ خیال ہوا۔ بقول اباجی‘ ان کا نظریہ بندہ کے نظریہ کے اَقرب ہے‘ ایک جگہ جم کر کام کیا جائے اور اردگرد عام طور پر گشت کیا جائے اور یہ کوشش کی جائے کہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ‘ جن میں گشت کیا جائے ان کا دینی شعور بھی بیدار ہو۔ اس سے ملا ہوا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ہم خیال بننے کے ساتھ ساتھ لوگ ہم عمل بھی بنیں اور اس دینی شعور کے مقابلہ میں وقت‘ روپیہ‘ اعزہ واقارب اور عزت وجان کو بھی ثانوی حیثیت دے دیں۔

ایک دوسرے موقعہ پر اباجی کا پیدل جماعت کے ساتھ مکہ سے وادیٔ فاطمہ کے راستے مدینہ منورہ کا سفر اور وہاں قیام کا ذکر ملتا ہے۔ اس دوران تبلیغی گشت‘ اجتماعات میں شرکت اور وقت لگانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۹۵۱ء کے حج کے بعد دسمبر میں اباجی اور بھائی جان کی حجازِ مقدس سے واپسی ہوئی۔ کراچی میں مکی مسجد (تبلیغی مرکز) کے اجتماعات میں شرکت رہی اور اباجی کا بیان بھی ہوا۔ وہاں سے آتے ہوئے ایک جماعت کے ساتھ ملتان میں وقت لگایا۔ پھر لاہور پہنچ کر گھر جانے کی بجائے ایک جماعت کے ساتھ اباجی تبلیغی سفر پر پشاور روانہ ہوگئے۔

مئی ۱۹۵۳ء میں اباجی دینی خدمت اور دعوت وتبلیغ کا مرکز بنانے کی نیت سے کوئٹہ روانہ ہوگئے اور عزیز دوست مولوی عرض محمد کے مدرسہ مطلع العلوم‘ بروری روڈ (کوئٹہ) مقیم ہوئے۔ تبلیغی سفر‘ بیانات اور دیگر متعلقہ سرگرمیاں بدستور جاری رہیں۔ تبلیغ کے موضوع پر دوستوں کی

ایک مجلس کے حوالے سے اباجی لکھتے ہیں:

’’دین میں وظائف اور چلوں کی ضرورت اور صحبت کے اثر پر گفتگو ہوئی۔ صحبت نبوی کی غیر موجودگی میں ان اذکار اور ان کے عامل بزرگوں کی صحبت سے فیض حاصل کرنا نفع بخش ثابت ہوا۔ تبلیغی جماعت بھی اس سے انکار نہیں کرتی اور تبلیغی پروگراموں میں اس کا مقام ہے۔ ہمیشہ حرکت میں رہنے کا کہیں مشورہ نہیں۔ گشت اور مقامی کام دونوں کے مناسب امتزاج سے ہی صحیح نہج پر کام ہوتا ہے اور اس کا ایک مناسب اندازہ جماعت کے پروگرام میں مقرر ہے۔ سال میں ایک مہینہ باہر‘ مہینہ میں تین دن دُور کے پڑوس کے لیے‘ ہفتہ میں ایک دن نزدیک کے پڑوس کے لیے اور باقی وقت اپنے مقام پر۔ اور گشت اور تعلیم کے علاوہ تیسرا نمبر ذکر کا ہے‘ جو اخلاقی اصلاح اور دین پر مقاومت اور شوق پختہ کرنے کے لیے ہے۔‘‘

ایک شبِ جمعہ کے بیان کا خلاصہ یوں ہے: اللہ کا زمین میں نائب ہوتے ہوئے اس کی مخلوق کی پرورش اور خدمت ہی اس (انسان) کا کام ہے اور اس خدمت کا بہترین اور اہم ترین حصہ دینی رہنمائی‘ زبانی دعوت دینا اور عملی نمونہ بننا ہے۔ اس دوران اباجی نے ایک تبلیغی سفر میں قلات میں بھی کچھ عرصہ قیام اور تبلیغی کام کیا۔ وہاں کے ایک بیان کے بارے میں درج ذیل تحریر ملتی ہے:

’’قرآن مجید کی سرداری اور اس کی روح کے متعلق باتیں ہوئیں۔ مسلمان سارے دین کو کہانیوں کی طرح پچھلے زمانے میں ممکن اور موجودہ زمانے میں ناممکن سمجھتا ہے‘ اور وعظ ونصیحت کی مجلسوں اور درس وسبق کے مجمعوں میں تو ہاں ہاں اور واہ واہ کہتا رہتا ہے‘ مگر جب خود اسے عمل کے لیے کہا جائے تو صاف انکار کر دیتا ہے‘ اور اللہ کی مدد آتی ہی ان اعمال اور اوصاف پر ہے جن سے یہ انکاری ہے۔ اس طریقے سے یہ مسلمان کہلانے والا ان اعمال اور اوصاف پر ڈٹا رہتا ہے جن پر اللہ کا غضب اور عذاب آیا کرتے ہیں‘ اور اللہ کی مدد کا امیدوار رہنا اس کے کسی کام نہیں آتا‘ کیونکہ اللہ اس نافرمان معاشرہ کو مدد دے کر دنیا میں پھیلانا نہیں چاہتا۔ اللہ کی ہر مشکل میں فتح پانے والی خصوصی مدد اسے نہیں ملتی۔‘‘

اسی طرح اباجی کی اپنے ایک دوست کے ساتھ اس موضوع ’’پاکستان میں انفرادی محنت سے دین کی کیا خدمت ہو سکتی ہے‘‘ پر گفتگو کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

’’اللہ تعالیٰ کی عظمت جو سارے دین میں مرکزی نکتہ کی حیثیت رکھتی ہے‘ اس کا احساس پھر سے زندہ کیا جائے۔ دین پر مبنی معاملات اور اخلاق کو تازہ کیا جائے اور دین پر جان و مال لگانے کے لیے انہیں فارغ کرنے کے واسطے اپنی معاشرت کو سادہ کیا جائے۔ اقل قلیل دین تو نصِ صریح سے ثابت‘ فرائض کی پابندی اور حرام سے اجتناب ہے‘ اخلاق میں وعدہ کا ایفاء‘ امانت کی ادائیگی اور سچ کا التزام ہے۔ ان سے کم دین کی پابندی کیا ہوگی۔ دین کے راستے میں کام کی قیمت کا اندازہ ظاہری نتائج سے نہیں لگایا جاتا۔ نیت اور طریقہ صحیح ہو تو وہ (محنت) اللہ کے نزدیک صحیح اور قابل قبول ہے اور کرنے والے کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں قائم ہے۔‘‘

قیامِ کوئٹہ کے دور کے روزنامچوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اباجی تبلیغی کام کی خامیوں کو ختم کر کے دعوت واصلاح کا نیا مؤثر کن انداز اپنانا چاہتے تھے اور ساتھیوں سے اس بارے میں گفت وشنید ہوتی رہتی تھی۔ ایسی ہی ایک محفل میں گزشتہ مذاکرات (وغیرہ) کا لب لباب یوں دہرایا گیا:

’’(۱) سارے دین اور اس کے احکامات میں جان محض اللہ کی مرکزی ہستی کی عظمت سے پڑتی ہے۔ یہ عظمت‘ محبت اور خوف‘ قرآن مجید کے درس‘ اس کے ذکر اور فکر سے حاصل ہو یا کسی اللہ کے بندے کی صحبت اور سلوک اور تصوف سے۔ (۲) دین کے شوق اور عمل کا اظہار عبادات‘ معاملات اور اخلاق میں ہوگا۔ ذاتی کردار بلند ہو‘ وعدہ پورا ہو‘ ذمہ داری کا احساس ہو‘ جھوٹ اور دھوکہ اور مردم آزاری اور غصب مفقود ہوں‘ محبت اور خدمت‘ خلوص اور صداقت موجود ہوں تو لوگ مانوس اور متاثر ہوں اور آپس میں جڑیں اور یہ جماعت اللہ کی فوج کا کام دے۔ (۳) اس خدمت اور قربانی کے لیے اپنے زائد اخراجات اور غیر ضروری مصروفیات میں کمی کرنا لابدی ہے‘ تاکہ اللہ کی راہ کے لیے جان اور مال بچے اور اسی طرز اور اسی رخ پر ترقی کی عادت پڑے۔ یہ نئی فرصت نماز سکھانے‘ خواندہ بنانے‘ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مفید مشورے دینے‘ اقتصادیات میں امداد باہمی کی راہ دکھلانے اور دینی زندگی میں آگے بڑھانے میں صرف ہوگی۔ دوستوں نے سب سن کر اتنی کوشش سے کامیابی حاصل ہونے پر شبہ کا اظہار کیا۔ بندہ نے صحابہ کی مثال پیش کی‘ مگر انہوں نے صحابہ والے ایمان کے فقدان پر افسوس کا اظہار کیا۔ بندہ نے اللہ کی مدد کا یقین دلایا۔‘‘

جولائی ۱۹۵۳ء کے اواخر میں حضرت مولانا محمد یوسف اور مولانا انعام الحسن کی مع ایک جماعت کے تبلیغی سفر پر کوئٹہ آمد ہوئی اور تقریباً تین دن قیام ہوا۔ حضرت جی کے ایک بیان کا خلاصہ ڈائری میں یوں درج ہے:

> ''ہر کام کی تکمیل کے لیے بعض شرائط لابدی ہیں۔ جب تک یہ شرائط پوری ہوتی رہیں' کام کی روح اور اصلیت بھی قائم رہتی ہے اور جہاں ان میں غیر شعوری طور پر بھی کمی آنے لگی' وہ کام رسم بننے لگا اور اس کا نفع کم ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اس کام کا اصل جذبہ اور روح اور اس کی تکمیل کا صحیح طریقہ' سب مفقود ہو جاتے ہیں۔ وہ محض رسم بن کر رہ جاتا ہے اور اس میں کوئی نفع نہیں رہتا۔ اس لیے ہر مفید اور دینی کام کی کڑی نگرانی چاہیے۔ مکہ میں دین محض رضائے الٰہی کے لیے تھا اور مدینہ میں دنیا کا نفع بھی ملنے لگا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے بدر کے بعد تنبیہہ کی کہ دنیا کی آرزو نہ ہونا چاہیے' دنیاوی فوائد اور نفع و نقصان سے بالا ہو کر اللہ کے احکام کی تعمیل ہو اور جان و مال اللہ کی راہ میں لگائے جائیں۔''

حضرت جی کے قافلے کے ساتھ آئے ہوئے اپنے ایک رفیق سے تبلیغی جماعت کے متعلق گفتگو کا مفہوم اس طرح سے ہے: لاہور کے تبلیغی احباب نے مقامی کام پر نئے سرے سے توجہ مبذول کی ہے اور حاجی ارشد صاحب کو اس جزئیہ کا امیر مقرر کیا ہے۔ امید ہے کہ دوستوں کے تعاون اور ان کی توجہ سے مقامی کام کے متعلق کمی جلد پوری ہو جائے گی اور ذاتی کردار اور اخلاق کو بھی بلند کرنے پر زور دیا جائے گا' ان شاء اللہ۔ اب حکمت اس کی مقتضی ہے کہ لاہور میں مسلسل کام کر کے ایک نمونہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے' جس میں کام کے طریقے سے بھی پوری واقفیت اور مہارت حاصل ہو جائے' تب کسی دوسری جگہ اسی قسم کے کام کی بنیاد رکھی جائے۔

ایک دوسرے موقع پر قریبی دوستوں کی موجودگی میں مولانا عبید اللہ بلیاوی (رفیق خاص حضرت جی) سے اباجی کی پاکستان میں تبلیغی کام کے متعلق بعض اہم امور پر یوں گفتگو ہوئی: امارت (تبلیغی جماعت) کی تبدیلی ضروری ہے۔ (محمد شفیع) قریشی صاحب مولانا محمد الیاسؒ کے ہم جلیس ہیں اور ہر معاملہ میں ان کی رائے قطعی ہے۔ پھر امیر بھی وہی ہیں اور فیصلہ انہی کے ہاتھ میں ہے۔ پھر اس فیصلہ کی تعمیل بھی صاحب خیر ہوتے ہوئے انہی کے ذریعہ ہوتی ہے' تو گویا کُل جماعت ہی یہیں ہے۔ باقی سب افراد ایک طرح سے معطل رہتے ہیں' جن کا مشورہ

اور فیصلہ میں کوئی دخل نہیں۔ محض ان کے احکامات کی تعمیل ہی ان کا کام ہے اور یہ صورت ایک نجی ادارہ اور ذاتی ملازمین سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ دینی تحریکوں میں زیادہ مشورہ اور رائے کی آزادی اور سب کا تعاون اور شرکت ضروری ہے' تاکہ سب کا (مشترکہ) کام معلوم ہو اور سب اس میں حصہ لیں اور (کسی) ایک کے جدا ہونے پر بھی کام چلتا رہے۔ (مغربی) پاکستان میں کوئی عالم' ذاکر' شاغل' حکیم' متوکل اور فارغ بزرگ امیر ہونے چاہئیں' جو پورا وقت تبلیغ کو دے سکیں' اور ان کا صاحب خیر اور مالدار ہونا ضروری نہیں۔ ان کے ہمراہ نائب اور مددگار کے طور پر اور جسے بھی متعین کریں۔ ایک عجلت کا موقع پا کر اباجی نے یہ اور کچھ دوسری باتیں حضرت جی کے گوش گزار بھی کیں۔ حضرت جی نے جواب دیا کہ یہ باتیں ان کے علم میں ہیں اور وہ ان پر غور بھی کر رہے ہیں۔ نیز اباجی کو وعظ بھی کیا کہ خلافِ طبع امور اور اشخاص سے گزارہ کرنے میں ترقی کا راز ہے۔ ساتھ ہی اباجی کا تاثر بھی درج ہے کہ ان صاحبان کی کارکردگی کا حضرت جی پر اتنا اثر ہے کہ ان کا بدلنا محال ہے۔ عصر کے بعد کی گئی حضرت جی کی ایک تقریر کا خلاصہ ڈائری میں یوں درج ہے:

> ''انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی جانوں پر کھیل کر دین کے باغ کی آبیاری اپنے خون سے کی۔ اور کبھی ایک لحظہ کے لیے اس قربانی سے نہ جھجکے' نہ تذبذب میں پڑے۔ اور اس راستہ میں اپنی عزت کی بھی پروا نہ کی۔ نہ بیوی بچوں' گھربار' وطن اور قوم کو کوئی اہمیت دی۔''

تیسرے دن حضرت جی مع رفقاء کوئٹہ سے واپس ہوئے۔ حضرت جی کی تقاریر کا بنیادی نکتہ اباجی نے اس طرح واضح کیا ہے: تقریروں کی بنیادی اور نمایاں بات توحید کا مضمون تھا' اللہ کی مخلوق' اللہ کی ملکیت' اللہ کی محتاج' اللہ کی مدد' اللہ کی رضا' اللہ کی اطاعت' اللہ کا حکم' اللہ کا کام' اللہ کا انعام۔ سارے دین میں بنیادی ہستی ہی اللہ کی ہے۔ اللہ کی عظمت اور اللہ کی توحید سے ہی سارے دین اور اس کے احکام میں جان پڑتی ہے۔ تب ہی اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت کی وقعت دلوں میں قائم ہوتی ہے اور ان کا عمل ذہن اور جسم پر طاری ہوتا ہے۔

چار مہینے سے اوپر بسلسلہ تبلیغ کوئٹہ ٹھہرنے کے بعد اباجی کی ستمبر ۱۹۵۳ء میں لاہور واپسی ہوئی۔ یہاں ایک نزدیکی رفیق سے تبلیغ کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کا ملخص اس طرح سے

ہے کہ مقامی کام کے بغیر متعدد گشت جو وہ ہر روز کرتے ہیں' ان کا چنداں فائدہ نظر نہیں آیا۔ شوق پیدا کرنے کے بعد اس کو پورا کرنے کا سامان اور صورت بھی خود ہی کرنی پڑے گی۔ مقامی طور پر جب تک تعلیم اور اس میں تسلسل اور پھر اس کے مطابق عمل اور اس میں تواتر نہ پیدا کیا جائے گا اور نہ قائم رکھا جائے گا تو گشت محض بیکار ہی نہیں بلکہ چل ہی نہیں سکے گا' لوگوں کی توجہ نہ حاصل کر سکے گا۔ تبلیغی جماعت کی کمزوری کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ مقامی کام کا فقدان اور اس کے مضر نتائج' گشتوں کی بھرمار اور تعلیم' محاسبہ اور ذکر کے بغیر ان کی بے روح کیفیت۔ مبلغین میں نئے عنصر کی کثرت کی وجہ سے بے احتیاطی اور اس کے ناموافق اثرات۔

مقامی کام کے بارے میں اباجی نے اپنا تاثر یوں بیان کیا ہے: عاجز نے خود مولانا محمد الیاسؒ سے جو بات سنی اور جس سے متاثر ہوا' وہ یہی گشتوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا اور (اپنے) مقام پر آ کر اسے پھیلانا تھا۔ یہی صورت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کرتے اور اپنے مقام پر آ کر اسے پھیلاتے اور یہی صورت اب بھی قابلِ عمل ہے۔ آپ (تبلیغی حضرات) لوگوں کو دین کا شوق دلاتے ہیں تو خود دینِ اسلام' اس کے ارکان اور احکام وہ کہاں سے سیکھیں گے؟ وہ عالم کہاں ہیں' جن کے بارے میں آپ گمان کرتے ہیں کہ وہ مسجدوں میں منتظر بیٹھے ہیں اور ہم لوگوں کو شوق دلوا کر ان کے پاس بھیج رہے ہیں۔ ان کا انتظار ختم ہو چکا اور وہ جا چکے۔ اب آپ کو ہی ان کی جگہ لینی پڑے گی۔

اباجی کو مولانا محمد الیاسؒ کی رفاقت اور ان کے تبلیغی نمونے کو دیکھنے اور اس میں حصہ لینے کی بنا پر تبلیغی جماعت سے جو جذباتی وابستگی تھی اور اب حضرت جی کے دور میں وہ جو کچھ فرق سمجھتے تھے' اس پر اپنے دردِ دل کا اکثر و بیشتر دوستوں میں اظہار کرتے اور کڑھتے رہتے۔ اسی کڑھن کا اظہار ان کی اس دور کی ڈائریوں میں نظر آتا ہے۔ ایک اور جگہ اس تاثر کو یوں ظاہر کیا ہے: مولانا محمد الیاسؒ کا طریقہ گشت پر نکال کر افراد کی تعلیم و تربیت کا تھا۔ دوسروں کو پیغام کا پہنچانا جتنا بھی اہم ہو' ایک ثانوی مسئلہ تھا۔ مولانا محمد یوسف کا شوق زیادہ سے زیادہ گشت پر مرکوز ہوتا جاتا ہے۔ جماعت کے افراد کی تعلیم و تربیت پر بھی زیادہ سے زیادہ توجہ ضروری ہے' ورنہ نتائج میں کمی کا اندیشہ ہے۔ (اور یہ اندیشہ بالکل درست ثابت ہوتا رہا ہے۔ راقم)

دسمبر ۱۹۵۴ء میں اباجی ایک عزیز دوست کے ہمراہ چند روز کے لیے بستی نظام الدین اور

سہارنپور (انڈیا) گئے۔ وہاں حضرت شیخ الحدیث کے ہاں حاضری ہوئی اور حضرت جی کی صحبت کا بھی لطف اٹھایا۔ ایک واقعہ اور حضرت جی کا تجزیہ کچھ اس طرح سے ہے:

''صبح چائے میں مولانا محمد یوسف صاحب سے ایک پٹھان معتقد نے دعا کی درخواست کی کہ اس کے بیٹے کی ایک موزوں جگہ شادی ہو جائے' چلہ کے لیے وہ تیار نہ تھا۔ مولانا نے سمجھایا کہ دعا کے لیے تو وہ تیار ہیں مگر خود اس کی جانب سے نیک اعمال میں انہماک دعا کی قبولیت میں مددگار ثابت ہوں گے۔ پٹھانوں نے جب اسلامی شعائر اختیار کیے اور کفر کے مقابلے میں جہاد کیا تو اللہ کی نصرت شامل حال ہوئی اور (وہ) سارے ہندوستان پر چھا گئے۔ بعد میں جب اس سلطنت میں ہی منہمک ہو گئے اور اس کے ذوق میں اللہ کے احکام ٹوٹنے لگے تو محض آپس میں کشت و خون رہ گیا۔ ترکوں اور عربوں پر بھی یہی دور گزر رہے ہیں۔ اور ان سے پہلے بنی اسرائیل پر' جن کا واقعہ قرآن مجید میں اس تفصیل سے آیا ہے' جب وہ اللہ کے احکام پر جان اور مال کھپانے لگے تو اللہ کی نصرت نے ہر سمت کامیاب کیا۔ لیکن جب اس کامیابی کے انعام' ملک اور دولت میں جی لگا لیا اور اس کے رکھ رکھاؤ اور تمتع میں اللہ کے احکام ٹوٹنے لگے تو وہ ملک اور دولت جیسے آئے' ویسے ہی چلے گئے۔ اس دہر میں قوموں کے اتار اور چڑھاؤ کا یہی اصول ہے اور جسے اب بھی ترقی منظور ہے' اسی زینے سے ہو سکتی ہے۔''

نمازِ فجر کے بعد حضرت جی کے ایک خطاب کا خلاصہ روزنامچے میں اس طرح تحریر ہے:

''آدمی مجموعہ ہے جسم اور روح کا۔ جسم بنا ہے مٹی سے' حیوانات اور نباتات سب مٹی سے بنے ہیں اور آدمی کے جسم میں غذا سے جو بچتا ہے' وہ فضلہ اور آخر مٹی بنتا ہے۔ جسم بھی مر کر اور گل سڑ کر مٹی بنتا ہے۔ روح کو فرشتہ منجانب اللہ لاتا ہے۔ ان دونوں میں یہ تضاد ہے کہ جسم کی جانب زیادہ توجہ روح کی ترقی میں مانع ہے اور روح کی جانب زیادہ توجہ جسم کی ترقی میں مانع ہے۔ جسم پر ساری محنت مادی اشیاء کا جمع کرنا اور ان کا فضلہ اور کوڑا بننا ہے۔ یہ ساری محنت خود غرضی اور حرص کا منبع ہے۔ ہر چیز اپنے ہی لیے درکار ہے اور یہ بات خود پرستی پیدا کرتی ہے۔ روح پر محنت آدمی کو باقی تمام حیوانات سے ممتاز اور مستثنیٰ کرتی ہے' حرص کی بجائے ایثار اور قربانی کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ آدمی چیزیں لینے کی بجائے چیزیں دینے پر لگا رہتا ہے۔ اس کے لیے اللہ اور آخرت پر ایمان ضروری ہے اور یہی ذوق اس ایمان کی نشانی ہے۔''

باہمی رفقاء کی ایک بات چیت میں حضرت جی نے فرمایا کہ جب تک پرانے جماعت میں موجود نہ ہوں' نئے لوگوں کو پتہ ہی کیا چل سکتا ہے کہ کیا کرنا ہے۔ان کی موجودگی اور نگرانی ضروری ہے۔اللہ کے سب احکامات کا پورا کرنا ضروری ہے' ورنہ دین کا نقشہ پورا نہ ہوگا اور یہ نقشہ پورا ہونا ہی ضروری ہے' خواہ کتنے چھوٹے پیمانے پر ہو۔واپسی میں اباجی نے حضرت شیخ الحدیث اور حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کی خدمت میں بھی حاضری دی اور دعا لی۔اوائل مارچ ۱۹۵۵ء میں رائے ونڈ کے سالانہ تبلیغی اجتماع میں حضرت جی مع رفقاء کے شامل ہوئے۔ اور اباجی نے بھی مع احباب حاضری دی۔حضرت جی کے اظہارِ خیال کا خلاصہ یوں درج ہے کہ مادہ عارضی اور فنا ہونے والی چیز ہے۔ جب تک اللہ کا امر شامل نہ ہو' یہ از خود کچھ بھی نہیں ہے۔اور اللہ کا امر ہو جائے تو وہ مادہ کا محتاج نہیں' اس لیے اس عارضی اور ادنیٰ زندگی میں بھی راحت اور کامیابی کے لیے اللہ کے احکام پر نظریں جمائیں۔پس مادی اشیاء کے حصول اور جمع کو مقصد نہیں بنانا چاہیے۔یہی بہتر اور انجامِ کار مفید طریقہ ہے۔

اسی ماہ بلال پارک کے ایک اجتماع میں حضرت جی کا ارشاد نقل ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ صرف اسّی آدمی تھے اور مخالف ساری دنیا۔لیکن اپنے کام میں لگنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کیسی نصرت فرمائی۔سو جو اللہ کے کام خصوصاً تبلیغ میں لگے گا' اللہ تعالیٰ اُس کی نصرت فرمائیں گے۔

اواخر ۱۹۵۵ء میں اباجی چند نزدیکی دوستوں کے ہمراہ انڈیا گئے۔ وہاں حضرت جیؒ اور شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ دونوں کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ حضرت جی کے ایک بیان کا خلاصہ اباجی نے یوں بیان کیا ہے کہ جان اور روح سے فرد اور جماعت چلتی ہے۔ ورنہ قالب بے روح اور جسم بے جان رہ جاتے ہیں۔تحریک بھی مرجاتی ہے اور رسم رہ جاتی ہے' جس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا' اور وہ بھی ایک دن اپنی موت مرجاتی ہے۔(اس بات کو اباجی نے اپنے دل کی آواز قرار دیا۔)

جنوری ۱۹۵۹ء میں بھی مولانا محمد یوسف (مع رفقاء) کی رائے ونڈ کے اجتماع پر تشریف آوری ہوئی۔حضرت جی کی مختلف تقریروں کے اقتباسات یوں درج ہیں:

''اللہ تعالیٰ دنیا سے منع نہیں فرماتا بلکہ دنیا کے جذبہ سے باز رکھتا ہے۔ جو اللہ کی راہ میں

خرچ کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس پر خرچ کرتا ہے۔ ہر محنت میں اثر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ نبی (مکرم ﷺ) کو ہدایت کے لیے بھیجا مگر ہدایت کا دینا (عطا کرنا) اپنے ہاتھ میں رکھا۔اللہ تعالیٰ کے حکم پر جان و مال لگانا' یہاں نصرتِ الٰہی اور عاقبت میں کامیابی کا موجب ہے۔ اپنی مرضی پر مال اور جان لگانا' یہاں غضبِ خداوندی اور عاقبت میں عذاب کا موجب ہے۔''

حضرت جی کے بارے میں اباجی کا ایک دلی تاثر درج ذیل ہے:

''مولانا محمد یوسف کی تقریر میں بڑی ترقی ہوئی ہے' خیالات بہت زیادہ صاف۔اب تو سارے معاشرے کی اصلاح اور ساری زندگی شریعت کے مطابق کرنے کی صاف بات کرتے ہیں۔زبان آسان اور عام فہم' سب لوگ سمجھنے لگے ہیں' اور بولنے میں قوت اور اثر۔اب تو ایک بہترین خطیب بن چکے ہیں۔اللہ تعالیٰ برکت اور نصرت عطا فرمائے' آمین۔''

بلال پارک میں حضرت جی کی ایک تقریر کا خلاصہ یوں ہے:

''اسلام بھی کسی پیشہ کی طرح محنت کر کے سیکھا جاتا ہے۔ جب اس میں مہارت پیدا ہوگی تو راحت کا باعث ہوگی۔افراد کی محنت' افراد کی راحت کا باعث ہوگی۔امت کی محنت' امت کی راحت کا باعث ہوگی۔ایک پہلو میں کوشش جزوی راحت لائے گی اور پوری شریعت پر عمل کامل راحت نصیب فرمائے گا۔مکہ کی مشقتوں سے مدینہ کی راحتیں کھلیں۔عوام جڑوں کے درجہ میں ہیں' ان پر محنت ساری قوم کو دین پر لائے گی۔اور خواص تنے کی طرح پھل اور سایہ دیں گے۔اسباب احکامِ الٰہی کی تعمیل کا نام ہے اور ان پر محنت ظواہر کے خلاف کرنے کو کہتے ہیں۔ مادی ذرائع کی قربانی سے اخلاقی قدریں اور دینی احکام زندہ ہوں گے۔ پیاس برداشت کرنے سے سیرابی' بھوک برداشت کرنے سے سیری اور ذلت برداشت کرنے سے عزت حاصل ہوگی۔''

اباجی کا حضرت جی کے بارے میں ایک جامع تبصرہ پیشِ خدمت ہے:

''مولانا محمد یوسف مدظلہ اس بار جو ایک برس کے بعد آئے ہیں تو ان کی تقریروں میں تین باتیں محسوس ہوئی ہیں۔اوّل خیالات کی وضاحت اور تفصیل' دوم زبان کا آسان اور عام فہم ہونا' سوم تاثر کی زیادتی۔ پہلے تو عوام بات سمجھ ہی نہیں سکتے تھے' اب خوب سمجھتے ہیں اور بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔تاثیر کا ایک چشمہ اُبل رہا ہے جو گرد و نواح کو

سیراب کر رہا ہے...... احباب نے پورا معاشرہ اور دین کے پوری طرح اندر آنا اور گشت کے بعد گھر میں بھی احکامِ الٰہی کی ویسی ہی تابعداری کے الفاظ کو نوٹ کیا کہ اب مولانا نے پوری تائید فرمائی ہے۔ بندہ نے مولانا محمد یوسف کی چھاتی سے لگ کر عرض کی کہ آپ نہیں بلکہ بندہ بول رہا تھا یا آپ عاجز کے دل کی بات کہہ رہے تھے‘ بلکہ اللہ تعالیٰ حق کہلوا رہا تھا۔ اب خیالات کی پوری تطبیق ہوئی۔ آپ تو شاید شروع سے ہی یہ کہتے ہوں مگر لوگ اب سمجھے۔ دعا کریں کہ آئندہ زندگی انہی اسباب پر محنت میں گزرے اور مولانا نے دعا کی۔ (آمین!)‘‘

حضرت جیؒ کی ایک اور تقریر کا خلاصہ ایک دوست کو بنائے گئے نوٹس سے یوں تحریر کیا گیا ہے: دنیا میں نفس کی خواہشات رکھی گئی ہیں۔ جو جانوروں کی طرح ان میں ہی غرق رہے گا‘ اس کے لیے عاقبت میں کچھ نہیں اور جو ان خواہشات کو حدود کے اندر پابند رکھے گا‘ جتنی اجازت اللہ نے دی اتنی غرض پوری کر لی اور باقی خواہش پر صبر کیا‘ اور اس طرح وقت اور مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے فارغ کیا تو ان لوگوں کے لیے اللہ کی نعمتیں ہیں‘ جن کا کوئی حساب نہیں اور ساری دنیا ان کی ایک نعمت کی قیمت نہیں۔ اچھی سے اچھی حسب پسند حوریں‘ جن کی شکل اور حسن بیان نہیں ہو سکتا‘ آدمی سے زیادہ اس سے محبت کرنے والی‘ اور مکان اور لباس اور کھانے (وغیرہ) یہ سب اس محنت اور صبر کا اجر ہیں جو دنیا میں کیا اور اللہ نے قبول کیا۔

اوائل اگست ۱۹۵۹ء میں اباجی مع ایک دوست انڈیا بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہونے گئے۔ نظام الدین‘ دہلی میں حضرت جی کے ہاں حاضری ہوئی۔ بعد میں ان کے ہمراہ بمبئی کے ایک تبلیغی اجتماع میں بھی شرکت ہوئی۔ حضرت جی کی ایک مجلس کا بیان ہے کہ چیزوں کی حیثیت شکل کی ہے۔ بیچ میں اصل اللہ کا حکم ہوتا ہے اور اسی کے حکم سے حاجت پوری ہوتی ہے‘ جیسے پانی اور پیاس۔ پانی میں پیاس بجھانے کا خاصہ محض اللہ کے حکم سے ہی کام کر سکتا ہے۔ ایک اور خطاب کا لب لباب یہ ہے: اللہ کے حکم کے مطابق کی گئی کوشش کامیاب اور اپنی ظاہری سمجھ کے مطابق کی گئی کوشش ناکام۔ چیزوں کے خواص اللہ کی قدرت ہیں‘ اور وہ جب چاہے انہیں موقوف کر دے۔ اللہ نے انسان کو تکوینی علوم دیے ہیں اور الٰہی علوم صرف نبی بتا سکتے ہیں‘ وہ علوم دنیاوی اسباب سے آزاد ہیں۔ دنیاداروں کی حرام کمائی جہاں جائے گی

بربادی پیدا کرے گی۔ اسے درست کیے بغیر علماء کے کام میں برکت نہ ہوگی۔ اس لیے لوگوں کی کمائیوں کے حلال ہونے اور معاشرہ میں معاملات کی اصلاح کی جانب خصوصی توجہ چاہیے۔

اسی اجتماع میں حضرت جیؒ کے ایک اور خطاب کا خلاصہ یوں ہے: آدمی میں بھی تضاد ہے اور معاشرے میں بھی تضاد ہے اور دنیا میں بھی تضاد ہے۔ ہر عضو اور ہر فرد اور ہر مخلوق کا جدا کام ہے جو دوسرا نہیں کرتا۔ آنکھ محض دیکھتی ہے‘ کسان کھیتی کرتا ہے‘ سورج روشنی اور گرمی دیتا ہے۔ شریعت نے دوسرے گروہ کی حاجت اس گروہ کا دین بنا دیا ہے۔ یہ اوروں کے لیے اپنا مخصوص کام کرتا ہے اور وہ اس کے لیے اپنا مخصوص کام کرتے ہیں۔ تمام اعضاء مل کر آدمی بنا‘ تمام طبقات مل کر معاشرہ بنا۔ امیر کا مال غریب پر خرچ ہو‘ غریب کی خدمت امیر کے کام آئے‘ وغیرہ۔

(جاری ہے)

❁❁❁

بقیہ: فقیہہ کون؟

اصحابِ رسول ﷺ تو اپنی بڑی عمر میں بھی علم حاصل کیا کرتے تھے۔ علمِ دین کے لیے تو انسان کو ہمیشہ راغب رہنا چاہیے۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت حسن بصریؒ نے تفقہ کے حاصل کو بہت عمدگی کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ اصل میں فقیہہ وہ ہے جو دنیا میں کم سے کم پر اکتفا کرنے کو تیار ہو اور آخرت کی جانب رغبت رکھتا ہو‘ جو اپنے دین کے امور میں بصیرت رکھتا ہو اور اپنی عبادات میں مداومت برتنے والا ہو۔ حضرت حسن بصریؒ آج جو فراموش کردہ تصورِ تفقہ کا ہے‘ اس کی طرح توجہ دلا رہے ہیں۔ صرف علم کا نام تفقہ نہیں ہے بلکہ دنیا سے زہد اختیار کرنا اور آخرت کی طرف راغب ہو جانا تفقہ کا حاصل ہے۔ فقیہہ وہ ہے جو علمِ دین کو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ اگر اس کے اطراف و جوانب میں کسی ایک جانب بھی افراط و تفریط پایا جاتا ہے تو بات نامکمل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا جامع تصور عطا فرمائے اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

(ترتیب و تسوید: محمد سمیع‘ کراچی)

❁❁❁

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع !

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لیے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (I,II,III)

قرآن وحدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لیے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لیے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی' 36۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 35869501-03
Email: distancelearning@tanzeem.org

Apr. 2017
Vol.66
Regd. CPL No.115
No.4
Monthly Meesaq Lahore